Shivaji University , Kolhapur

B.A.S.Y-SEM – IV

URDU-OPTIONAL (CBCS)

PAPER – VI (URDU GHAZAL)

انتخابِ اردو شاعری

بی اے سال دوم میقات چہارم

Syllabus Book for Distance Education ,Shivaji University,Kolhapur

BY:Dr.Shaikh Maheboob

Associate Professor,Shivaji College, Udgir

Shivaji University, Kolhapur

URDU (OPTIONAL)

(P-VI

B.A.S.Y (CBCS)

SEMESTER-IV

By

Dr.Shaikh Maheboob

(Associate Professor, Shivaji College, Udgir)

w.e.f.2019-2020

تفصیلی نصاب

اکائی:1۔غزل کی تعریف،ہئیت،آغاز وارتقا،مقبولیت کے اسباب اور جدید غزل کی تعریف وہئیت

1۔غزل کی تعریف اورہئیت

2۔اردو غزل کاآغاز وارتقا

3۔غزل کی مقبولیت کے اسباب

4۔جدیداردوغزل: تعریف اورہئیت

اکائی:2۔درج ذیل غزلوں کا تفصیلی مطالعہ

1۔ہمارے آگے تراجب کسونے نام لیا	(میر تقی میرؔ)
2۔پتہ پتہ بوٹابوٹاحال ہماراجانے ہے	(میر تقی میرؔ)
1۔یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا	مرزاغالبؔ
2۔دائم پڑاہواترے درپر نہیں ہوں میں	مرزاغالبؔ
1۔بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں	۔فراقؔ گورکھپوری
2۔نرم فضاکی کروٹیں بھی دل کودکھاکہ رہے گئیں	فراقؔ گورکھپوری
1۔کمال عشق ہے دیوانہ ہوں میں	اسرارالحق مجازؔ
2۔شوق کے ہاتھوں اے دل مضطرب	اسرارالحق مجازؔ
1۔چھپ چھپ سلگتاہے دیاتم بھی تودیکھو	بشر نوازؔ
2۔ہر نئی رُت میں نیاہوتاہے منظر میرا	بشر نوازؔ
1۔آئینوں سے دھول مٹانے آتے ہیں	سلیم محی الدین
2۔زندگی جب اُڑان بھر دینا	سلیم محی الدین

اکائی:3۔درج ذیل شعرا کا تعارف اوران کی غزل گوئی کا مطالعہ

1۔میر تقی میرؔ　2۔مرزاغالبؔ　3۔فراقؔ گورکھپوری

4۔اسرارالحق مجازؔ　5۔بشر نوازؔ　6۔سلیم محی الدین

***

اکائی:1۔غزل کی تعریف،ہئیت،آغاز وارتقا، مقبولیت کے اسباب اور جدید غزل کی تعریف وہئیت

1.1۔مقصد

1.2۔تمہید

1.3۔موضوع کی وضاحت

1.3.1۔غزل کی تعریف اور ہئیت

1.3.2۔اردو غزل کا آغاز وارتقا

1.3.3۔غزل کی مقبولیت کے اسباب

1.3.4۔جدید اردو غزل: تعریف اور ہئیت

1.4۔مشقی سوالات

1.5۔خلاصہ

1.6۔الفاظ ومعنی

1.7۔سفارش کردہ کتب

1.1۔ مقصد:

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ ۔۔۔

1۔ غزل کے معنی و مفہوم اوراس کی تعریف سے واقف ہوں گے

2۔اردو غزل کے آغاز وارتقاپر روشنی ڈال سکیں گے

3۔ غزل کی مقبولیت کے اسباب بیان کر سکیں گے

4۔ غزل جدید کی شناخت اور تعریف کر سکیں گے

1.2۔ تمہید:

غزل اردو شاعری کی سب سے خوبصورت صنف سخن ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اسے اردو شاعری کی آبرو کہہ کراس کے ساتھ انصاف ہی کیاہے کیونکہ اپنے آغاز سے لے کر آج تک اس صنف کو کبھی زوال نہیں آیاہاں ایک مرتبہ اس کی رفتار ضرور سست ہوئی تھی لیکن اس نے جلد ہی زمانے کے تقاضوں کو اپنے اندر سمونے اور ہر موسم میں زندہ رہنے کا ہنر سیکھ لیاہے۔اس اکائی میں غزل کی تعریف،اس کی ہئیت آغاز وارتقا،اس کی مقبولیت کے اسباب کا بیان اور جدید اردو غزل کی ہئیت اور تعریف پر روشنی ڈالی جائے گی تاکہ طلبا کی اردو غزل سے متعلق بنیادی معلومات میں اضافہ ہو سکے۔

1.3۔ موضوع کی وضاحت

1.3.1۔ غزل کی تعریف اور ہئیت

غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنے یا عورتوں کی باتیں کرنے کے ہیں یا پھر عورتوں کے متعلق باتیں کرنا ہیں۔ ہرن کے بچے کے منہ سے نکلنے والی درد بھری آواز کو بھی غزل کا نام دیا جاتا ہے۔ قیس رازی نے العجم میں غزل کے سلسلے میں یہ نشاندہی کی ہے کہ لفظ غزل دراصل غزال سے مشتق ہے۔ڈاکٹر سٹن گاس نے کہاہے کہ غزل سے مراد سوت کاتنے کے ہیں۔

ادبی اصطلاح میں غزل اس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں ہر طرح کے موضوع پر دو مصرعوں میں اظہار خیال کیا جا سکتا ہے۔یعنی اس صنف میں صرف حسن و عشق کا بیان ہی نہیں کیا جاتا بلکہ دنیا کی رنگینیوں کا تذکرہ بھی، فلسفہ بھی تصوف بھی ہے،سیاست بھی ہے، سماجیت بھی،تاریخ بھی ہے معیشت بھی غرض انسانی زندگی سے متعلق ہر پہلو، ہر مسئلے پر غزل کہی جا سکتی

ہے۔ نہ صرف حیات انسانی بلکہ حیات و کائنات کے تمام مسائل اور موضوعات کو غزل نے اپنے دامن میں جگہ دی ہے اس لیے یوں کہہ سکتے ہیں کہ غزل وہ صنف شاعری ہے جس میں حیات و کائنات کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی جاسکتی ہے۔ جس کا ہر شعر دوسرے شعر سے جداگانہ اور مختلف ہوتا ہے اور اپنے آپ میں ایک مکمل اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ غزل کے اشعار کی تعداد کم سے کم پانچ ہوتی ہے اور زیادہ سے زیادہ گیارہ اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے لیکن اردو کے بعض شعرا نے اس بھی زیادہ اشعار پر مشتمل غزلیں لکھیں ہیں۔ غزل کا کوئی ایک موضوع نہیں ہوتا اس کے ہر شعر میں الگ الگ موضوع پر خیال بندی کی جاسکتی ہے۔ غزل کا کوئی عنوان نہیں ہوتا ہے جیسا کہ نظم، قصیدہ، مرثیہ وغیرہ کا ہوتا ہے۔ غرض کہ غزل کو ہم رنگارنگ شاعری کا گلدستہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

ہیت کے لحاظ سے غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو چند اشعار پر مشتمل ہو۔ اس کا ہر شعر ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتا ہے۔ ردیف نہ ہونے کی صورت میں ہم قافیہ ہوتا ہے۔ پہلا شعر جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں مطلع جبکہ آخری شعر جس میں تخلص اسرعمال ہوتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔ غزل کا ہر شعر ایک مستقل اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے ہر شعر میں الگ ہی مفہوم باندھا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایک پوری غزل بھی ایک مضمون پر مبنی ہوسکتی ہے۔ غزل ایک بحر میں لکھی جاتی ہے۔ غزل میں تین اہم کردار خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ جس میں عاشق، محبوب اور رقیب شامل ہیں۔ شاعر ہمیشہ اپنے محبوب کے حسن و جمال کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ پھر اس کے بعد اپنے محبوب کے ظلم و ستم پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ اور بعد ازاں اپنے رقیب کو بھی برا بھلا کہ جاتا ہے۔ شاعر یہ تمام صورتِ حال ایک خاص ترتیب سے بیان کرتا ہے جیسے ایک شعر میں اگر محبوب کے حسن کی کیفیت بیان کردی جاتی ہے تو دوسرے شعر میں ظلم و ستم اور تیسرے میں ہجر کا دکھ بیان کیا جاتا ہے۔ اس طرح دل کے جذبات کا اظہار، ہجر و وصال کی کیفیت، شکایت زمانہ، تصوف اور حقیقت و عرفان کے موضوعات سے بحث کی جاتی ہے۔ غزل کا دائرہ وسیع ہے اس میں آج کے دور میں ہر طرح کا موضوع ڈالا جا سکتا ہے۔ اور اقبال کی شاعری میں تو غزل نے ایک نئی اکائی کی صورت جنم لیا ہے۔ آج کے دور میں بھی اس میں درخشاں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ حالیؔ نے کیا خوب کہا ہے۔

ہے جستجو خوب سے خوب تر کہاں　　　　اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جاکر نظر کہاں

1.3.2۔اردو غزل کاآغاز وارتقا

یہ صحیح ہے کہ فارسی کے اثرات اردو غزل پر بہت گہرے اور ہمہ گیر ہیں لیکن وہ خیالات جن کے زیر اثر اردو غزل کی نشو ونماہوئی، ہندوستان کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں اور جن کی بدولت یہاں کی ساری زندگی بدل گئی، ہر شعبہ میں انقلاب رونماہوئے، طور طریقے بدلے، معیار بدلے، پرانی اقدار ایک نئے سانچے میں ڈھل گئیں اور ان سے زندگی کے ہر شعبہ میں ایک جدت پیدا ہو گئی اور نئے رجحانات، نئی تہذیب، نئی ثقافت اور نئے نظام معاشرت کو وجود میں لانے کا باعث بنے۔ مسلمانوں کی آمد سے قدرتی طور پر ان کے اثرات یہاں کے لوگوں پر اور یہاں والوں کے اثرات ان پر پڑے جن میں عرب بھی تھے ایرانی بھی، مغل بھی تھے تورانی بھی، ترک بھی تھے افغانی بھی، غرض یہ کہ مختلف تہذیبوں کے علم بردار ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ ان کی اپنی اپنی مخصوص معاشرت تھی، مخصوص رجحانات تھے اور انہوں نے اپنی انہی خصوصیات کے ساتھ نئی تہذیب اور ثقافت کی تعمیر و تشکیل میں حصہ لیا۔ اس نئی تہذیب و ثقافت نے فنون لطیفہ پر بھی اثر ڈالا اور آگے چل کر اردو غزل کو بیدار کیا۔ چوں کہ ہندوستان آنے والوں میں اکثر ایران ہو کر آئے تھے اس لیے ایرانی کلچر و تہذیب اور ایرانی مذاق ان کی طبیعت ثانیہ بن گیا یہی وجہ ہے کہ بادی النظر میں وہ تہذیب جس نے غزل کو پیدا کیا پوری طرح ایرانی رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے، حالاں کہ وہ در حقیقت مختلف تہذیبوں کے امتزاج سے صورت پذیر ہوئی تھی۔

صنف غزل کا بنیادی موضوع معاملات عشق کی مختلف کیفیات کی ترجمانی ہے، اس لیے غزل کو عام طور پر عشق و محبت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مختلف ذہنی کیفیات اور جذباتی واردات کا ترجمان سمجھ لیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غزل میں زندگی کے متنوع پہلوئوں کا ادراک اور اس کی ترجمانی موجود ہے۔ فلسفیانہ حقائق کی گہرائیاں بھی ہیں، سماجی و معاشرتی تقاضوں کا احساس بھی ہے، اس میں تاریخی واقعات بھی ملتے ہیں، ماحول کی عکاسی بھی ہوتی ہے اور اس میں جمالیاتی پہلو بھی نظر آتے ہیں، یہ اس کا حسن ہے کہ یہ غم روزگار کو غم جاناں بنا دیتی ہے۔

آلام روزگار کو آساں بنا دیا — جو غم ہوا اسے غم جاناں بنا دیا

غزل چونکہ شاعری کی سب سے زیادہ لطیف صنف ہے اس لیے اس کی زبان، انتخاب الفاظ، اسلوب اور طرز ادا بھی لطیف، نازک، سادہ اور صاف ہونے چاہئیں۔ مضمون کی نزاکت کی مناسبت سے الفاظ کی بھی لطافت و نزاکت از حد ضروری ہے۔ غزل کی تاثیر کا انحصار انہی پر ہے اور یہ کام مشق اور محنت چاہتا ہے مثلاً

ایک ہلکا سا تبسم اس قدر ہلکا کہ بس

بس یہی یا قیمت نقد و دل و جاں اور بھی؟

یہاں ایک لفظ "بس" نے وہ لطف پیدا کر دیا کہ بس۔ اس کی جگہ کوئی اور لفظ استعمال ہوتا تو یہ وجدانی اثر پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

اردو کے لیے اگرچہ شمالی ہندوستان میں زمین تیار ہوئی لیکن ابتدا میں اسے فروغ دکن میں ہوا، ابتدائی دور میں حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ شمالی ہندوستان سے زیادہ دکن میں اردو زبان و شاعری کے لیے ماحول پیدا ہوا، اسی حقیقت کا اعتراف میرؔ نے اس طرح کیا ہے:

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے

معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

دکن میں غزل کی ترقی کا زمانہ ولیؔ اور سراجؔ کا زمانہ ہے، دکن میں مغلوں کا غلبہ ہوا تو ٹھیٹھ ہندی کا اثر کم ہوتا گیا اور فارسی کی آمیزش نے اس میں زیادہ سادگی، سلاست و لطافت، رنگینی و نزاکت کی خصوصیات پیدا کر دیں، اس طرح انداز بیان اور طرز اظہار میں زیادہ سے زیادہ بانکپن آتا گیا، رعنائی رونما ہوتی گئی اور دلکشی بڑھتی گئی۔ ولیؔ کے یہاں فارسی روایات کے اثرات ہندی کے ساتھ ملے جلے نظر آتے ہیں اور جو شیرینی و گھلاوٹ ولیؔ کے یہاں ملتی ہے وہ اس فارسی اور ہندی کی آمیزش کا نتیجہ ہے۔ شعر کو ردیف اور قافیے سے سجایا، ردیف وار دیوان بنائے، فارسی بحریں اردو میں لائے، فارسی تراکیب اور فارسی مضامین کو داخل کیا۔ ولیؔ کی غزلوں کا بیشتر حصہ عشق مجازی کی کیفیات کی ترجمانی پر مشتمل ہے، ان کی غزلوں میں مجموعی طور پر دیکھا جائے تو حسن صنف لطیف کا جمال نظر آتا ہے، انہوں نے جو کچھ محسوس کیا اور جس مخصوص حسن سے وہ متاثر ہوئے ہیں اس کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی غزلوں میں خارجی حسن کی کیفیت کا بیان بھی ہے اور ساتھ ہی آفاقی واردات و کیفیات کی ترجمانی بھی:

خوب رو خوب کام کرتے ہیں

یک نگہ سوں غلام کرتے ہیں

عجب کچھ رنگ رکھتا ہے شب خلوت میں گل رو سوں

سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

اردو کی ابتدائی شاعری تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے اور یہ وہ زمانہ تھا جب شاعری اور درویشی مترادف الفاظ سمجھے جاتے تھے۔ تصوف کے مضامین کو اس طرح بیان کرنا کہ غزل کی لطافت اور معرفت الٰہی کے مضامین عشق مجازی سے بالکل بے

میل نہ ہو جائیں، یہی قدما کا کمال تھا- اردو میں ولیؔ سے لے کر دردؔ تک اساتذہ کے کلام کو دیکھیے، شراب کے مضامین ان بزرگوں کے یہاں بکثرت ملتے ہیں مگر بحیثیت مجموعی ان کے یہاں شراب کے مضامین سے وہی معرفت کی شراب مراد ہے- یہ مضامین تغزل کے دائرے میں بیان ہوتے ہیں- جیسے ولیؔ مسئلہ جبر کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

آلودہ کیوں نہ ہوے دامان پاک زاہد　　　جب دست ناز نین میں جام شراب آئے

صنف غزل اور اس کے منفرد اشعار میں جو عناصر اس صورت و ہیئت کی تشکیل میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں ان میں اختصار و اجمال، رمز و ایما، اشارہ و کنایہ، تشبیہ و تمثیل کو بڑا دخل ہے- اختصار و اجمال صنف غزل کی لازمی خصوصیت ہے- رمزیت و ایمائیت کے بغیر سارا جمالیاتی تاثر ختم ہو جاتا ہے، اس کے لیے فنکاروں نے بڑی کاوش کی ہے، اگر یہ کاوش نہ ہوتی تو غزل کی روایت میں محبت و الفت، حسن و قبح، خوشی و غم، عہد و وفا، عقل و جنون، دیر و حرم، دیر و خانقاہ، گل و بلبل، شمع و پروانہ، گلچیں و باغباں، گل و صحرا، قیس و لیلیٰ، فرہاد و شیریں، وامق و عذرا، طور و موسی، یوسف و زلیخا اور اس طرح کے نہ جانے کتنے اشاروں، تمثیلوں، تلمیحوں اور تملیحوں کا وجود نہ ہوتا، موضوع و مواد میں وسعت و ہمہ گیری پیدا نہ ہوتی اور اظہار بیان میں حسن و دلکشی بھی نہ پائی جاتی- بقول مرزا غالبؔ:

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام　　　چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو　　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

غزل نے متنوع اور رنگارنگ عشقیہ کیفیات کو اپنے دامن میں جگہ دے کر ان جذباتی تقاضوں کو پورا کیا ہے جو کسی اور صنف شاعری سے پورے نہیں ہو سکتے ہیں، ان عشقیہ کیفیات میں آفاقیت پائی جاتی ہے- ولیؔ، میرؔ، سوداؔ، دردؔ، غالبؔ اور مومنؔ نے جن عشقیہ کیفیات کو پیش کیا تھا وہ آج بھی ہمیں خود ہماری اپنی کیفیات معلوم ہوتی ہیں-

دیکھنا تقریر کی لذت کو اس نے جو کہ　　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

آخری دور میں جب علم و ادب میں مشرقی فنکاروں کی صناعیوں کے ساتھ ساتھ مغربی اہل قلم کی عقل و دانش کا پیوند لگا تو واعظ و خانقاہ، رند و میخانہ کے مضامین کی جاذبیت کم ہونے لگی جس کے نتیجے کے طور پر غزل کی مقبولیت پر اثر پڑنا ناگزیر تھا- اس دور میں اقبال نے اردو غزل میں تصوف کے اس رنگ و پہلو کا آغاز کیا جس کا اب تک ہماری شاعری میں فقدان تھا- ترک دنیا، عزلت گزینی اور زندگی کی جد و جہد سے فرار کا نام تصوف رکھ لیا گیا تھا- اب تک ہمارے شعرا نے تصوف کی روشنی میں زندگی اور فلسفہ کو نہیں دیکھا تھا- اقبالؔ نے فلسفہ تاریخ، ارتقائے تمدن اور اجتماعی زندگی پر تصوف کی روشنی ڈالی، اقبال نے کہا:

حدیث بے خبراں ہے تو بازمانہ ساز　　　زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ ستیز

انسان کی فطرت تنوع پسند واقع ہوئی ہے، اس کی طبیعت میں انتشار بھی فطری ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ غزل میں تنوع و رنگارنگی کی خصوصیات پاتا ہے تو اس کے ذہن کو سکون حاصل ہوتا ہے-

اردو غزل کے تاریخی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صنف اُردو میں فارسی شعر و ادب کے اثر سے آئی اور فارسی میں عربی قصیدے کی تشبیب سے الگ ہو کر وجود پذیر ہوئی۔ علامہ شبلی نعمانی کے خیال کے مطابق یہ بار بار لکھا جا چکا ہے کہ ایران میں شاعری کی ابتدا قصیدہ سے ہوئی اور ابتداء میں غزل جو طبع سے نہیں، بلکہ اقسام شاعری کے پورا کرنے کی غرض سے وجود میں آئی۔ قصیدہ کی ابتداء میں عشقیہ شعر کہنے کا دستور تھا، اس حصے کو الگ کر لیا تو غزل بن گئی، گویا قصیدہ کے درخت سے ایک قلم لے کر الگ لگالیا۔ متذکرہ مباحث کی روشنی میں ہم کہے سکتے ہیں کہ اردو غزل فارسی سے نمودار ہوئی ہے .

اردو غزل ہمیشہ فارسی شاعری کی مقلد رہی۔اس کی وضاحت ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے اس طرح کی ہے کہ شعر و شاعری کا عموماً اور ایشیائی شاعری کا خصوصاً عشق و محبت کے جذبات واحساسات سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ ہماری اردو شاعری سراسر فارسی شاعری کی متبع ہے اپنے ابتدائی حالات میں عشق و محبت و معشوق و دیگر لوازمات عاشقی کے وہی سانچے وہی تصورات اور وہی معیار رکھتی ہے جو ایران میں اس وقت رائج تھے۔

بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی: ''ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب کے سانچے میں ڈھلی ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے رنگ و آہنگ، سمت و رفتار اور وزن اور وقار ملا ہے''۔ فراق گورکھپوری کے بقول ''اردو غزل کا عاشق اپنے محبوب کو اپنی آنکھوں سے نہیں اپنی تہذیب کی آنکھوں سے دیکھتا ہے''

فراق کی غزلوں کی معنویت کا اندازہ ان کی اردو غزل سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے غزل کو اپنی روایت سے وابستہ کرنے کی کوشش میں مخلوط اور مشترکہ ثقافتی اقدار سے ہمیں اسرِ نو روشناس کریا ہے۔ خاص طور سے ہندوستانی اساطیر کا وہ فلسفیانہ پہلو جس سے اردو غزل اس وقت تک تہی پہلو تھی۔ ہندو دھرم میں عشق کا جو کرشنائی روپ ہے اس کا وہ تکلم، اس کا وہ لب ولہجہ فراق کی وساطت سے اردو غزل میں تخلیقی سطح پر از سرِ نو دریافت ہوا ہے:

یہ کہاں سے بزم خیال میں اڈ آئیں چہروں کی ندیاں ؛ کوئی مہ چکاں، کوئی خونفشاں، کوئی زہرہ وش، کوئی شعلہ رو

کرشن تا سقراط کوئی کس کس کا نام گنائے ؛ کیا کیا قیدی دیکھے اے دنیا تیرے زندنوں نے

حسن و محبت آپ اپنی توہین ہیں اگر معصوم نہ ہوں ؛ تھوڑی دیر کو بھولے بن لیں، ہم بھی سیانے تم بھی سیانے

ان اشعار کی روشنی میں پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ فراق کی شاعری بنیادی طور پر معنویت، احساس اور نغمگی کی تثلیت سے تشکیل پاتی ہے۔ ان کی غزلوں میں روایت کی پاسداری بھی ہے اور اس سے انحراف اور اضافہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ نئے نئے استعارات، نئی تشبیہات اور نئی نئی پیکر تراشیوں سے مزین اور مملو ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی غزلوں

میں غنائیت اور نغمگی کا احساس کو بہ کو بہ ملتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ غزل کی ہئیت میں متعدد تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھی اسی صورت میں اصغر نے غور و خوص کیا ۔ وہ سمجھتے ہیں غزل مطرود، مردود اور معون ہو رہی تھی اسے نیم وحشی صنف سخن اور گردن زندنی قرار دیا جارہا تھا تو ایسے حالات پر اصغر کا خیال ہے۔ "غزل شاعری کی اعلیٰ ترین صنف ہے۔ لیکن اس وقت جب کہ شاعر کی فطرت اس کی حقیقی صلاحیت رکھتی ہو۔ ورنہ غزل سے زیادہ لفظی گرہ بازیوں اور سطحی ہرزہ سرائیوں کا موقع کس اور صنف شاعری میں نہیں۔" ۷۴ اس کے علاوہ ان کا عقیدہ یہ تھا "فن کی ترقی تقسیم عمل سے ہے۔

یہ دراصل میں ہندوستانی اردو غزل گو شعراء سے متعلق تعصب ہے وہ غالب کا نام نہیں لیتے، اور خیال بندی کے تحت ہندوتانیوں کا کہیں کہیں ذکر بھی کرتے ہیں تو بیدل اور ناصر کے آگے شاز ہی جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے ہندوستانی معاشرہ میں غالب کے کلام کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو غزل کو تقریباً گردن زدنی قرار دینے کے بعد دلّی اور لکھنؤ کے دبستانوں کی چھان پھٹک کے نتیجے میں جو فضا بن رہی تھی اس میں غزل پر اصرار کرنا خود کو خطرے میں ڈالنے کے متر دادف تھا۔ ایک اور حقیقت یہ بھی ہے کہ اردو غزل کی جہاں گردن مار دینے کو جارہا تھا وہیں دکنی شعراء نے اس میں معانی افرینی، نئی طرز احساس اور تہذیبی اور اخلاقی اقدار اس میں ڈال کر ایک نئی غزل کو اعجاد کیا۔ اسی لیے سرزمیں دکن کو یہ فخر ہے کہ یہ غزل کی پرورش میں محمد قلی قطب کے بعد اپنے اپنے طور پر اس کی حفاظت کرتے رہے۔ اسی لیے عادل شاہی حکمراں اور مغل شاہی حکمراں نے بھی اس ترقی و ترویج میں ہر ممکن معاون و مددگار بنتے رہے۔ لیکن دکنی شعراء کے کلام کی خاص معنویت یہ رہی کہ وہ وقت اور حالات کے تقاضوں کے ساتھ رہے اور وہی تبدیلیاں کرنا پسند کیا جو سماج کی ضرورت تھی۔ ویسے بھی کسی بھی فن پارے کے مطالعہ کے وقت یہ خیال آتا ہے کہ فن کی تخلیق میں خیال زیادہ اہمیت کا حامل ہے یا ہیئت۔ فن کار ہیئت کے ذریعے تجربے میں تنظیم، حسن اور ترتیب پیدا کر کے اپنے جذبات و تاثرات کو مؤثر انداز میں پیش کرتا ہے۔ یوں خیال اور اس کی پیش کش دونوں اپنی اپنی جگہ اہمیت اور قدر و قیمت کے حامل ٹھہرتے ہیں۔ اور ان دونوں کے امتزاج سے ہی ایک ایسا فن پارہ معرضِ وجود میں آتا ہے۔ جو اپنی صفائی اور جاذبیت کے باعث قلب و نگاہ کو اپنا اسیر کر لیتا ہے۔

اردو غزل کے قدیم مسکن کے معاملے میں بھی دکن کو شمال پر فوقیت حاصل ہے۔ دکن کی غزلوں کے سلسلے میں بات عموماً محمد قلی قطب شاہ سے شروع کی جاتی ہے۔ جِس کی عظمت کئی لحاظ سے مسلمہ ہے۔ اردو غزل کی ترقی میں میں چند غزل گو شعرا اور تحریکات کے اہم انجمنوں کی خدمات میں دکنی دور میں خواجہ محمد واحد ارفانی، حسن شوقی، علی عادل شاہ ثانی شاہی، نصرتی، سید میراں ہاشمی، دکن کا پہلا صاحبِ دشاعر یوان محمد قلی قطب شاہ غزل گو شاعر بھی تھا۔ لیکن صنف میں جن دکنی شعراء نے خاص طور پر مقبولیت حاصل کی ان میں وؔلی دکنی، سراج اورنگ آبادی کا نام سر فہرست لیا جا سکتا ہے۔ شمالی ہندی کے فارسی شعراء ولی کے کلام کو دیکھ کر ہی غزل کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ شمالی ہندوستانی میں اردو غزل کا کے اہم

شعراء میں شاہ حاتم، شاہ مبارک آبرو، مرزا مظہر جانِ جاں اور آرزو وغیرہ کے نام ہیں۔ایہام گوئی کی تحریک میں اردو غزل گو شعراء میں آبرو، ناجی، مضمون، یکرنگ، احسان اللہ خاں احسان، سجاد، ایہام گوئی کی تازہ تحریک کے شعرا میں یقین، میری تقی میر، مرزا سودا، خواجہ میر درد، قائم چاندپوری، میر سوز وغیرہ کے نام اہم ہیں۔دبستان لکھنو کے اہم غزل گو شعراء میں جرأت،انشاء، مصحفی، رنگین، نسیم دہلوی، آتش، ناسخ، تلامذہ ناسخ لیکن ان سب الگ منفرد شاعر انیس ؔجسے غزل گو کی حیثیت کم مقبولیت حاصل ہوئی پھر بھی ان کی غزل گوئی سے متعلق ناؔصر نے کہا تھا ''عالم شباب میں چندے مشق غزل گوئی رہی۔''(ص ۳۰۵) شریف العلماآزادؔ کے نام خط میں خود انیس کے حوالے سے ان کی غزل گوئی کا حال اس طرح لکھا ہے ''میر انیس اپنی ابتدائی حالت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب مشاعرے میں غزل پڑھتا تو دو چار دس آدمی روکر لوٹنے لگتے اور میر خلیقؔ کے سامنے ذکر ہوتا کہ میر انیس خوب پڑھتے ہیں تو (خلیق) بہت بگڑتے۔''

دلی کے بزم آخر کے غزل گو شعراء میں مومن، ذوق، غالب، تلامذہ وغیرہ اہم ہیں۔اردو غزل اور رامپور کے اہم شعراء میں مرزا داغ، امیر مینائی نے غزل کے فروغ میں اہم خدمات انجام دیے ہیں۔اس کے علاوہ انجمن پنجاب کی تحریک سے جڑے اہم اردو غزل گو شعراء میں الطاف حسین حالی کے بعد علامہ اقبال نے اس صنف میں فلسفہ پیش کر کے ایک نئے انداز کی بنیاد رکھی۔اس درمیان شبلی نے بھی ''دستۂ گل'' فارسی غزلوں کا مجموعہ لکھا۔ جس میں سے بارہ چودہ اشعار ایسے ہیں جنہیں ''گرما گرم'' کہا جاسکتا ہے۔

مست وپُر عربدہ تنگش بکشم در آغوش؛تشنۂ وصلم وتاکئے بہ محابا بشم

من فعائے بتِ شوخے کہ بہ گنگام وصال؛ بمن آموت خود آئین ہم آغوش را

ان کے بعد، حسرت موہانی، فراغ گورکھپوری، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، جگر مرادآبادی، یاس یگانہ، خورشید الاسلام، ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، شاذؔ تمکنت، شہریار، بشیر بدر، ظفر اقبال، احمد مشتاق، شکیب جلالی، ساقی فاروقی، عادل منصوری، محمد علوی، پرکاش فکری، اطہر نفیس، صہبا اختر، محبوب ہاشمی، منظور خزاں، بمل کرشن اشکؔ وغیرہ نے اردو غزل کے فروغ میں رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک، ترقی پسند شعراء اور حلقہ ارباب ذوق کے تحت شعراء نے اردو غزل کو فروغ دیا ہے۔

سرزمین دہلی کے اردو غزل گو شعراء نے ایک طرف ان رجحانات کو قبول کیا ہے۔ جو ہماری سماجی اور تہذیبی تاریخ سے وابستہ ہیں۔ دوسری طرف ان تحریکوں کے اثرات کو اپنایا ہے۔ جو دوسری زبانوں اور ادبوں سے مخصوص ہیں اور ہر نئی روشنی کو دیدہ و دل میں بسا ہے۔اور ہر نئے تجربے کا اپنی زندہ وتابندہ روایات کے تناظر میں خیر مقدم کیا ہے۔اسی لیے دہلی کو علم و ادب کا گہوارہ مانا گیا ہے۔ یہاں مقالہ موضوع اعتبار سے تفصیل میں نہیں جاسکتے لہذا دہلی کے اہم غز گو

شعراء کے نام دکھایا جارہا ہے۔اجمل اجملی، پنڈت ہری چند اختر، جگن ناتھ آزاد، اظہار اثر، افضل پشاوری، امن لکھنوی: چوپی ناتھ، انور صابری، انور صدیقی، امیر قزلباش، بانی منیچنارا، بسمل سعیدی، بیخود دہلوی، کمار پاشی، غُلام ربانی تاباں، من موہن تلخ، نورجہاں ثروت، جاوید وششٹ، حسن نعیم، حیات لکھوی، مسعود حیات، خار زشتی دہلوی، خالد محمود، شجاع خاور، درشن سنگھ، راج نرائن راز، روش صدیقی، زبیر رضوی، ساحر ہوشیار پوری، ساغر نظامی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، رفعت سروش، سلام مچھلی شہری، سلطان نظامی، سید غلام سمنانی، سیفی پریمی، نرش کمار شاد، شاہد ماہلی، شمیم حنفی، شمیم عثمانی، شمیم کرہانی، شہاب جعفری، صادق، صغیر احمد صوفی، ضیا فتح آبادی، طالب دہلوی، طالب چکوالی، ظفر مراد آبادی، یعقوب عامر، عتیق اللہ، عرش ملسیانی: پنڈت بال مکند، عزیز بکھروی، عزیز وراثی، علیم اختر، عنوان چشتی، مغیث الدین فریدی، ہیرالال فلک، قمر سنبھل، قیصر حیدری، کامل قریشی، کرشن موہن، کمال احمد صدیقی، گلزار دہلوی، گوپال متّل، گوہر دہلوی: دگمبر پرشاد جین، کیلاش ماہر، تلوک چند محروم، محسن زیدی، مخمور سعیدر، مشیر جھنجھانوی، پنڈت رام کرشن مضطر، مظفرِ جنفی، پنڈت آنند نرائن مُلّا، ممتاز مرزا، بشیشو پرشاد، میکش امروہوی، اندر سروپ دت نادان، نظمی مہدی نظمی، مہیش چند نقش، ذکیہ سلطانہ نیّر اور واجد سحر وغیرہ کی جدید اردو غزل کی بدلتی ہئیت اپنے آپ میں منفرد ہے۔

1.3.3۔غزل کی مقبولیت کے اسباب:

غزل بنیادی طور پر ایک داخلی صنف ہے اور شاعر وہی بیان کرتا ہے جو اس کے دل پر بیت رہی ہو حالانکہ یہی کیفیات دوسروں کے دل پر بھی گزر چکی ہوتی ہیں۔ شاید معاشرے کا سب سے زیادہ حساس شخص شاعر ہوتا ہے۔ وہ ان کیفیات کو زیادہ غریب سے محسوس کرتا ہے اور دیکھتا ہے لہذا سننے والے کو اپنی داستان معلوم ہوتی ہے یعنی میری روداد زمانے کی کی جو بھی سنتا اسے اپنی داستان معلوم ہوتی۔ اس طرح غزل آپ بیتی کی بجائے جگ بیتی بن جاتی۔ جو کچھ شاعر کے دل پر گزرتی ہے اس کے لئے تنقید میں مختلف الفاظ موجود ہیں احساسات جذبات واردات قلبی واردات تجربہ شعری تجربہ یا جمالیاتی تجربہ وغیرہ ان کے بر عکس غزل کا دائرہ وسیع ہوتا ہے جذبات واحساسات کے علاوہ غزل میں فکر کا جو عنصر غالب آگیا ہے وہی پیش نہیں کرتا جو وہ سوچتا ہے بلکہ وہ بھی پیش کرتا ہے جو دیکھتا ہے۔ جب شاعر کا خیال یا اس کا فطری جذبہ احساس بن کر غزل کے شعر میں ڈھل جائے اسے فکر محسوس کہا جاتا ہے۔

غزل کی مقبولیت کا ایک سبب اس کا ایک خاص موضوع عشق ہے۔ عشق ایسا جذبہ ہے جس سے کوئی خالی نہیں۔ یوں تو عشق کے ہزاروں روپ ہیں لیکن سب سے ارفع و اعلیٰ وہ عشق ہے جو بندے کو حقیقی خدا سے ملاتا ہے۔ کوئی دل ایسا نہیں جس میں عشق کا جذبہ نہ ہو جذبہ عشق کی تاثیر مسلم ہے اور غزل آغاز ہی سے اس جذبے کے اظہار کے لیے وقف تھی۔ غزل کی مقبولیت کا ایک اور سبب رمز و ایما کا فن ہے یعنی شاعر کا اشارے کنایہ میں باتیں کرنا، وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے عام طور پر غزل کا شعر مکمل اکائی ہے۔ شاعر کو اپنا تجربہ اپنی واردات ایک شعر میں سمونی ہوتی ہے کیسا ہی پیچیدہ تجربہ کیوں نہ ہو اس کے اظہار کے لئے شاعر کے پاس دو مصروں کا ننھا سا پیمانہ ہوتا ہے چنانچہ وہ کمال فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسی تدبیریں اختیار کرتا ہے کہ وہ جس تجربے سے دوچار ہے وہ اسے ان دو مصرعوں میں سما جائے۔ اس لیے وہ ایسی تدبیر اختیار کرتا ہے کہ جو بات اشاروں میں کہہ رہا ہے قاری جو غزل کی روایت سے آگاہی رکھتا ہے وہ ان اشاروں کا مطلب خود نکال لیتا ہے۔ غزل کی مقبولیت کا ایک اہم سبب اس کی موسیقیت ہے۔ اگر شعر میں ترنم یا موسیقی نہ ہو تو وہ شعر کہلانے کا مستحق نہیں۔ غزل میں یہ خوبی اتنی زیادہ ہے کہ دوسری کوئی صنف اس کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ غزل کسی ایک بحر میں ہوتی ہے یعنی ہر مصرعے کا وزن یکساں ہوتا ہے جس سے کوئی ایک خاص دھن پیدا ہوتی ہے سید عابد علی عابد لکھتے ہیں کہ موسیقی میں جو کام ضرب کرتی ہے قافیہ وہی کام غزل میں کرتا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خان لکھتے ہیں ہیں کہ ردیف غزل کے پاؤں میں پائل یا جھانجھن کا حکم رکھتی ہے۔ یہ اس کی موسیقیت اور ترنم اور موزونیت کو بڑھاتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ غزل کا شاعر لفظوں کے انتخاب اور ان کی ترتیب میں موسیقیت اور ترنم کا خیال رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل اچھی طرح سے گائی جاسکتی ہے اس لیے محفلوں مشاعروں میں غزل بے حد مقبول ہے۔ غزل کی مقبولیت کا ایک اہم راز یہ ہے کہ غزل کے اشعار آسانی سے یاد ہو جاتے ہیں اور مختلف موقعوں پر ان کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ایک شعر میں ایک تجربہ اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جب کوئی شخص اس قسم کے تجربے سے دوچار ہوتا ہے وہ آسانی سے اس تجربے کو تو دہرا سکتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایک مصرعے سے بھی یہ کام لیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جن کی بنیاد پر غزل باقی اصناف پر چھائی رہی ہے اور آئندہ بھی اس کا مستقبل بہت روشن نظر آتا ہے یہی چند اہم وجوہات ہے جو غزل کی مقبولیت کے اسباب میں شامل ہیں۔

1.3.4۔ جدید اردو غزل: تعریف اور ہئیت

ہیئت کے آکسفورڈ انگلش ۔اردو میں معنی کسی شے یا طریقۂ کار کی خاص شکل صورت ، وضع، ترتیب اعضاوااجرا' اور مخصوص شکل اختیار کرنا یا بنانا، مخصوص ڈھانچہ بنانا' ہدائیت شدہ ہئیت ہونا، جیسا بتایا گیاہے۔انگریزی ادبیات میں ہیئت کے لیے Form کا لفظ مستعمل ہے، یہاں یہ کہنا بے موقع نہیں ہے کہ انگریزی میں Form کا لفظ جہاں ہیئت کے لیے برتا جاتا ہے وہاں صنف کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مغربی تنقید نگاروں کے ہاں یہ لفظ بالعموم اسی دوہری معنویت کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ مروجہ اصطلاحی مفہوم کے اعتبار سے صنف اور ہیئت ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں، صنف کا تعلق کسی فن پارے کے مواد اور موضوع سے ہے جب کہ ہیئت کسی تخلیق کے ظاہری ڈھانچے اور صورت کا نام ہے۔اس کے برعکس غزل کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن میں اس کا ظاہری ڈھانچہ جلوہ گرہونے لگتا ہے اور اس کے ہیئتی خدوخال (جیسے مطلع، مقطع، ردیف، قافیہ وغیرہ) ظاہر ہونے لگتے ہیں۔اس اعتبار سے غزل کو ہیئت کہنا زیادہ مناسب ہے۔ محققین نے ہیئت کے دائرے میں تکنیک، آہنگ، لفظیات اور دیگر محسناتِ کلام کو شامل کر کے اسے ایک پیچیدہ اور خطرناک حد تک ناقابلِ گرفت اصطلاح بنا دیا ہے۔ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تکنیک، آہنگ اور لفظیات وغیرہ ہیئت کے ساتھ ایک لطیف ربط رکھتے ہیں۔اسی وجہ ہے کہ ہیئت کی کوئی جامع تعریف قائم کرنا مشکل ہے۔اس سلسلہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے کہا ہے ''تجربہ جب اظہار کے قالب میں ڈھلتا ہے تو عموماً اپنی ہیئت، وزن۔ آہنگ اور صورت خود اپنے ساتھ لاتا ہے، لیکن اس صناعی میں شاعر کے شعور کو بھی دخل ہوتا ہے اور یہیں سے قصد کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔''اس کے برعکس ایک دوسرا نقطۂ نظر یہ پیش کرتے ہیں ہیئتیں معروضات میں موجود ہوتی ہیں جسے تخلیق کار اپنی پسند یا ضرورت کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ جس سے آلائشوں اور غیر متعلق و غیر اہم عناصر سے پاک ہئیت پیدا ہو جاتی ہے۔اس طرح کے لیٹریچر کی ہئیتی صفائی اور تازگی کے باعث دل پذیری اور رعنائی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ کیوں کہ فن کار پہلے سوچتا ہے پھر اظہار کے لیے خاص ہیئت تلاش کرتا ہے۔ متذکرہ ہیئت اسی طرح تسلیم کر بھی لیا جائے تو ہیئتوں کا شمار ممکن نہیں رہتا اور نہ ہی ہیئت کے تجربات کی تخصیصی صورت کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ تخلیق کار شعوری طور پر ہیئت تلاشتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق اس میں ترمیم و اضافہ کرتا ہے۔اس ضمن میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر غیاث الدین فاروقی نے لکھا ہے ''غزل اپنی نمود اول سے تاحال حسن و عشق کا محور رہی ہے ، نقادوں کی بے رحمیوں اور زمانے کی چیرہ دستیوں کے باوجود غزل کی محبوبیت و مجازیت زندہ و تابندہ ہے، جذبہ عشق کی پر اسراریت کے لیے غزل کا ایمائی و اشارتی اسلوب ہی موزوں ہے، دل کے زخموں کی جراحت غزل ہی میں چمن کھلا سکتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس مولانا شبلی نعمانی نے 'شعر العجم'' جلد پنجم کے صفحہ ۶۵ میں خیال بندی کے سلسلے میں ایک معرکہ آرا بات کہی کہ اس کی وجہ سے عشقیہ شاعری کو 'نقصان' پہنچا۔ دراصل میں خیال بندی غزل کے میدان کا وسیع فن ہے۔ لیکن شبلی اس تصور کے خلاف تھے۔ شبلی اس بات کو بھی تسلیم کرتے تھے کہ اس طرز نے شاعری نے ترقی پیدا کر کی۔

جدید غزل

جدید غزل میں سائنسی اور صنعتی انقلاب کے بعد پیدا ہونے والے مسائل و میلانات کا تخلیقی اظہار شعرا نے اپنی ذات کے حوالے سے کیا ہے۔ اس لیے جدید غزل میں تنہائی اور اس کے متعلقات کے طور پر خوف، بے اعتمادی، نارسائی، اداسی اور تشکیک وغیرہ کے تخلیقی اظہار کو حاوی رویے کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں جدید غزل حسن و عشق کے موضوعات سے بھی آراستہ ہے لیکن ان تمام موضوعات کا اظہار ترقی پسندوں کی طرح راست انداز میں نہیں بلکہ نئی اور پرانی علامتوں، استعاروں، تشبیہوں اور بعض دوسری صنعتوں کے ذریعے تخلیقی طور پر ہوا ہے۔ جدید غزل گو شعرا نے رسمی مضمون آفرینی، فرسودہ طرزِ بیان اور تصنع کو خیر باد کہا اور فطری، غیر رسمی اور انفرادی شعری اظہار کی راہیں ہموار کیں۔ اس لیے جدید غزل میں زبان و بیان کا نیا ذائقہ بھی ہے اور اس کا رشتہ روایت سے بھی استوار ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جدید شعرا کے یہاں بعض کلاسیکی شعرا کی بازیافت کا عمل بھی نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ناصر کاظمی، خلیل الرحمن اعظمی، ابنِ انشا اور فراق کی غزل میر کے لہجے کی خوشبو سے معطر ہے۔ اس کے برعکس ظفر اقبال، حسن نعیم اور نشتر خانقاہی کی شعری کائنات میں غالب کا رنگ بکھرا ہوا ہے۔ بعض جدید شعرا نے غزل کی مروجہ ہیئت کو برقرار رکھتے ہوئے اینٹی اور ٹیڑی غزل جیسے تجربات بھی کئے ہیں اور اس کے اوزان میں کمی بیشی کر کے آزاد غزل کہنے کی کوشش بھی کی ہے، یہ الگ بات ہے کہ ایسے تمام تجربات محض تجربات کی حد تک ہی محدود ہو کر رہ گئے۔ غزل کا جو رنگ روپ پہلے تھا وہ فکری و فنی سطح پر تغیرات کے بعض مرحلے طے کرتا ہوا موجودہ عہد میں بھی اسی طرح برقرار ہے۔

حالی نے غزل میں در آنے والی خرابیوں کو آئینہ کیا تھا اور اس کی اصلاح کے لیے مشورے بھی دیے تھے لیکن یہ غلط فہمی نہ معلوم کہاں سے پیدا ہو گئی کہ حالی بطور صنف، غزل کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ حالی کا موقف غزل کی صنفی حیثیت کو ختم کرنا نہیں تھا بلکہ اصلاح کے ذریعے اس کے موضوعی اور تخلیقی امکانات کو روشن کرنا اور ان کو وسعت سے ہمکنار کرنا تھا۔ اس رجحان نے آگے چل کر غزل کی مخالفت کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ جوش ملیح آبادی، عظمت اللہ خاں، نظم طباطبائی اور کلیم الدین احمد وغیرہ نے پر جوش انداز میں غزل کی مخالفت کی لیکن ان تمام مخالفتوں کے باوجود غزل کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی۔ اس نے ہر دور اور ہر زمانے میں اپنا کردار بخوبی نبھایا۔ اس میں خیال کی وسعتیں بھی پیدا ہوئیں اور اظہار کی نئی نئی صورتیں بھی نکلیں۔ بہت سے شعرا جیسے اقبال، فانی، حسرت، جگر، اصغر، یگانہ، فراق اور فیض نے غزل میں نیا بانکپن پیدا کر کے اسے وسعت سے

ہمکنار کیا۔

نئی اور کلاسیکی غزل میں مضامین اور طرزِ ادا کا جو فرق دکھائی دیتا ہے، وہ دراصل پرانی تہذیب واقدار کے مسمار ہونے اور اس کی جگہ نئی تہذیب واقدار کے تیزی کے ساتھ پاؤں پسارنے سے سامنے آیا۔ ظاہر سی بات ہے کہ دونوں تہذیبوں کے درمیان زمانی فرق ہونے کے ساتھ ساتھ مسائل و معاملات میں بھی نمایاں فرق موجود تھا۔ جسے صنعتی اور میکانکی دور نے جنم دیا تھا اور جس نے انسانی زندگی اور اس کے معیار و معاملات کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ ان بدلے ہوئے حالات میں ثقافتی انتشار، یکسوئی اور دل جمعی کے فقدان اور بے چہرگی کے احساس نے فرد کے اندر تنہائی، بیزاری اور بے یقینی کی کیفیت پیدا کر دی۔ نیا شاعر اپنی غزلوں میں انہیں مسائل کا اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن اس کے لہجے میں تلخی اور ترشی نہیں بلکہ خود کلامی اور آہستگی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نئی غزل کا بنیادی مسئلہ فرد کی تنہائی اور اس کا داخلی اضطراب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سائنس اور صنعتی ترقی نے جہاں انسانی زندگی میں آرام اور آسودگی کی کیفیت پیدا کی، وہیں اس نے انسانی قدروں کو پامال کر کے خود غرضی اور مطلب پرستی کو بڑھاوا بھی دیا۔ آرام و آسائش کی چاہت نے انسان کے شعور اور اس کے اجتماعی اندازِ فکر کو نقصان بھی پہنچایا ہے۔ انسانی اور سماجی رشتے کمزور ہوئے اور انسان کی تمام تگ و دو اس کی ذات تک محدود ہو کر رہ گئی۔ جس سے بے یقینی، تشکیک، تنہائی اور اداسی کے رویے نے جنم لیا۔ جدید غزل نے کسی نہ کسی شکل میں ان رویوں کی نمائندگی کی ہے۔ اسی احساس کو نئے شاعروں نے اپنے اشعار میں اس طرح پرویا ہے:

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا، جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے، ذرا فاصلے سے ملا کرو **(بشیر بدر)**

اس عہد سے وفا کا صلہ مرگِ رائیگاں
اس کی فضا میں ہر گھڑی کھونے کا رنگ ہے **(منیر نیازی)**

کوئی ہے جو ہمیں دو چار پل کو اپنا لے
زبان سوکھ گئی یہ صدا لگاتے ہوئے **(شہریار)**

جدید غزل میں تنہائی کا ذکر کوئی نیا موضوع نہیں ہے، اسے اردو غزل کی روایت میں دور تک مختلف شکلوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ البتہ نئے اور پرانے زمانے میں تنہائی کی بعض قدریں مشترک ہونے کے باوجود اس کے اسباب مختلف ہیں۔ جدید دور کی برکتوں

نے زندگی کو جتنی تیزی کے ساتھ جس طرح برق رفتار بنایا، اتنی ہی تیزی کے ساتھ انسان بلندیوں کو چھونے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی ہوس میں اپنی تہذیب واقدار کو پامال کرتا چلا گیا۔ اس نئے دور کے انسان نے ترقی کے بہت سے مرحلے تو ضرور طے کئے لیکن اس کی آنکھوں سے منزل جیسے عنقا ہو گئی۔ یہی وہ حالات تھے، جنھوں نے انسان کے اندر خود پرستی کی کیفیت پیدا کر دی اور وہ مسلسل ایک خاص جد وجہد میں سر گرداں رہنے لگا۔ اس کے نزدیک تمام رشتے ناتے معدوم ہو گئے اور وہ اپنائیت اور قربت کے احساس سے محروم ہو گیا۔ اسی خود پرستی نے فرار اور تنہائی کی کیفیت کو فروغ دیا اور یہی تنہائی جدید دور کے انسان کا مقدر ہو گئی نیز جدید شعرا کی غزل کا غالب رجحان بن گئی۔ چند اشعار بطورِ نمونہ پیش ہیں:

لمبی سڑک پہ دور تلک کوئی بھی نہ تھا
پلکیں جھپک رہا تھا دریچہ کھلا ہوا (عادل منصوری)

تنہائی کی یہ کون سی منزل ہے رفیقو
تا حدِ نظر ایک بیابان سا کیوں ہے (شہریار)

رات ہمیں پھر تنہا پا کے جانے کیا کر بیٹھے
حسرت سے ہم دیکھ رہے ہیں دن کا سورج ڈھلتے (پرکاش فکری)

1.4۔ مشقی سوالات

ا۔ غزل کی تعریف اور ہئیت پر روشنی ڈالئے؟

۲۔ غزل کے آغاز وارتقا کا جائزہ لیجیے؟

۳۔ اردو غزل کی مقبولیت کے اسباب بیان کیجئے؟

۴۔ جدید غزل کی تعریف اور ہئیت بیان کیجئے؟

1.5۔ خلاصہ

غزل اردو شاعری کی سب سے زیادہ مشہور و معروف صنف سخن ہے۔ غزل اردو شاعری کی سب سے خوبصورت صنف سخن ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اسے اردو شاعری کی آبرو کہہ کر اس کے ساتھ انصاف ہی کیا ہے کیونکہ اپنے آغاز سے لے کر آج تک اس صنف کو کبھی زوال نہیں آیا ہاں ایک مرتبہ اس کی رفتار ضرور سست ہوئی تھی لیکن اس نے جلد ہی زمانے کے تقاضوں کو اپنے اندر سمونے اور ہر موسم میں زندہ رہنے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔

ہئیت کے لحاظ سے غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو چند اشعار پر مشتمل ہو۔اس کا ہر شعر ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتا ہے۔ ردیف نہ ہونے کی صورت میں ہم قافیہ ہوتا ہے۔پہلا شعر جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں مطلع جبکہ آخری شعر جس میں تخلص استعمال ہوتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔ غزل کا ہر شعر ایک مستقل اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے ہر شعر میں الگ ہی مفہوم باندھا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایک پوری غزل بھی ایک مضمون پر مبنی ہوسکتی ہے۔ غزل ایک بحر میں لکھی جاتی ہے۔

دکن میں غزل کی ترقی کا زمانہ ولیؔ اور سراجؔ کا زمانہ ہے، دکن میں مغلوں کا غلبہ ہوا تو ٹھیٹھ ہندی کا اثر کم ہوتا گیا اور فارسی کی آمیزش نے اس میں زیادہ سادگی، سلاست و لطافت، رنگینی و نزاکت کی خصوصیات پیدا کردیں، اس طرح انداز بیان اور طرز اظہار میں زیادہ سے زیادہ بانکپن آتا گیا، رعنائی رونما ہوتی گئی اور دلکشی بڑھتی گئی۔ولیؔ کے یہاں فارسی روایات کے اثرات ہندی کے ساتھ ملے جلے نظر آتے ہیں اور جو شیرینی و گھلاوٹ ولیؔ کے یہاں ملتی ہے وہ اس فارسی اور ہندی کی آمیزش کا نتیجہ ہے۔شعر کو ردیف اور قافیے سے سجایا، ردیف وار دیوان بنائے، فارسی بحریں اردو میں لائے، فارسی تراکیب اور فارسی مضامین کو داخل کیا۔ ولیؔ کی غزلوں کا بیشتر حصہ عشق مجازی کی کیفیات کی ترجمانی پر مشتمل ہے، ان کی غزلوں میں مجموعی طور پر دیکھا جائے تو حسن صنف لطیف کا جمال نظر آتا ہے، انہوں نے جو کچھ محسوس کیا اور جس مخصوص حسن سے وہ متاثر ہوئے ہیں اس کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

شمالی ہندوستانی میں اردو غزل کا کے اہم شعراء میں شاہ حاتم، شاہ مبارک آبرو، مرزا مظہر جانِ جاں اور آرزو وغیرہ کے نام ہیں۔ایہام گوئی کی تحریک میں اردو غزل گو شعراء میں آبرو، ناجی، مضمون، یکرنگ، احسان اللہ خاں احسان، سجاد، ایہام گوئی کی تازہ تحریک کے شعرا میں یقین، میری تقی میر، مرزا سودا، خواجہ میر درد، قائم چاندپوری، میر سوز وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ دبستان لکھنو کے اہم غزل گو شعراء میں جرأت، انشاء، مصحفی، رنگین، نسیم دہلوی، آتش، ناسخ، تلامذہ ناسخ لیکن ان سب الگ منفرد شاعر انیسؔ جیسے غزل گو کی حیثیت کم مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے بعد، حسرت موہانی، فراغ گورکھپوری، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، جگر مرادآبادی، یاس یگانہ، خورشید الاسلام، ناصر کاظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی، شاذؔ تمکنت، شہریار، بشیر بدر، ظفر اقبال، احمد مشتاق، شکیب جلالی، ساقی فاروقی، عادل منصوری، محمد علوی، پرکاش فکری، اطہر نفیس، صہبا اختر، محبوب ہاشمی، منظور خزاں، بمل کرشن اشکؔ وغیرہ نے اردو غزل کے فروغ میں رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک، ترقی پسند شعراء اور حلقہ ارباب ذوق کے تحت شعراء نے اردو غزل کو فروغ دیا ہے۔ سرزمین دہلی کے اردو غزل گو شعراء نے ایک طرف ان رجحانات کو قبول کیا ہے۔ جو ہماری سماجی اور تہذیبی تاریخ سے وابستہ ہیں۔ دوسری طرف ان تحریکوں کے اثرات کو اپنایا ہے۔ جو دوسری زبانوں اور ادبوں سے مخصوص ہیں اور ہر نئی روشنی کو دیدہ ودل میں بسا ہے

۔اور ہر نئے تجربے کا اپنی زندہ و تابندہ روایات کے تناظر میں خیر مقدم کیا ہے۔اسی لیے دہلی کو علم و ادب کا گہوارہ مانا گیا ہے۔

غزل کی مقبولیت کا ایک سبب اس کا ایک خاص موضوع عشق ہے۔ عشق ایسا جذبہ ہے جس سے کوئی خالی نہیں۔یوں تو عشق کے ہزاروں روپ ہیں لیکن سب سے ارفع و اعلیٰ وہ عشق ہے جو بندے کو حقیقی خدا سے ملاتا ہے۔ کوئی دل ایسا نہیں جس میں عشق کا جذبہ نہ ہو جذبہ عشق کی تاثیر مسلم ہے اور غزل آغاز ہی سے اس جذبے کے اظہار کے لیے وقف تھی۔ غزل کی مقبولیت کا ایک اور سبب رمز و ایما کا فن ہے یعنی شاعر کا اشارے کنایہ میں باتیں کرنا، وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے عام طور پر غزل کا شعر مکمل اکائی ہے۔ شاعر کو اپنا تجربہ اپنی واردات ایک شعر میں سمونی ہوتی ہے کیسا ہی پیچیدہ تجربہ کیوں نہ ہو اس کے اظہار کے لئے شاعر کے پاس دو مصروں کا ننھا سا پیمانہ ہوتا ہے چنانچہ وہ کمال فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسی تدبیریں اختیار کرتا ہے کہ وہ جس تجربے سے دوچار ہے وہ اسے ان دو مصرعوں میں سما جائے۔اس لیے وہ ایسی تدبیر اختیار کرتا ہے کہ جو بات اشاروں میں کہہ رہا ہے قاری جو غزل کی روایت سے آگاہی رکھتا ہے وہ ان اشاروں کا مطلب خود نکال لیتا ہے۔ غزل کی مقبولیت کا ایک اہم سبب اس کی موسیقیت ہے۔اگر شعر میں ترنم یا موسیقی نہ ہو تو وہ شعر کہلانے کا مستحق نہیں۔غزل میں یہ خوبی اتنی زیادہ ہے کہ دوسری کوئی صنف اس کا مقابلہ نہیں کر سکی۔اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ غزل کسی ایک بحر میں ہوتی ہے یعنی ہر مصرعے کا وزن یکساں ہوتا ہے جس سے کوئی ایک خاص دھن پیدا ہوتی ہے سید عابد علی عابد لکھتے ہیں کہ موسیقی میں جو کام ضرب کرتی ہے قافیہ وہی کام غزل میں کرتا ہے۔

جدید غزل میں سائنسی اور صنعتی انقلاب کے بعد پیدا ہونے والے مسائل و میلانات کا تخلیقی اظہار شعرا نے اپنی ذات کے حوالے سے کیا ہے۔اس لیے جدید غزل میں تنہائی اور اس کے متعلقات کے طور پر خوف، بے اعتمادی، نارسائی، اداسی اور تشکیک وغیرہ کے تخلیقی اظہار کو حاوی رویے کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔علاوہ ازیں جدید غزل حسن و عشق کے موضوعات سے بھی آراستہ ہے لیکن ان تمام موضوعات کا اظہار ترقی پسندوں کی طرح راست انداز میں نہیں بلکہ نئی اور پرانی علامتوں، استعاروں، تشبیہوں اور بعض دوسری صنعتوں کے ذریعے تخلیقی طور پر ہوا ہے۔ جدید غزل گو شعرا نے رسمی مضمون آفرینی، فرسودہ طرزِ بیان اور تصنع کو خیر باد کہا اور فطری، غیر رسمی اور انفرادی شعری اظہار کی راہیں ہموار کیں۔اس لیے جدید غزل میں

زبان وبیان کا نیا ذائقہ بھی ہے اور اس کا رشتہ روایت سے بھی استوار ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جدید شعرا کے یہاں بعض کلاسیکی شعرا کی بازیافت کا عمل بھی نظر آتا ہے۔

1.6۔الفاظ و معنی

بازیافت	دوبارہ آباد کرنا
رمز وایما	پوشیدہ بات یا اشارہ
تصنع	بناوٹ، دکھاوا
عشق مجازی	دنیا سے عشق، جھوٹا عشق، وقتی عشق
مضمون آفرینی	نیاپن، جدت وندرت
تشکیک	شک، شبہ

1.7۔سفارش کردہ کتب

ا۔تاریخ ادب اردو۔۔۔۔نورالحسن نقوی

۲۔اردو ادب کی مختصر تاریخ۔۔۔۔سیدہ جعفر

۳۔اردو شاعری کا فنی ارتقا۔۔۔۔۔۔فرمان فتحپوری

اکائی:2۔درج ذیل غزلوں کا تفصیلی مطالعہ

2.1۔ مقصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ ۔۔۔

1۔میرؔ،غالبؔ،فراقؔ،مجازؔ،بشرؔ،سلیمؔ،کی غزل نگاری سے واقف ہوں گے

2۔میرؔ،غالبؔ،فراقؔ،مجازؔ،بشرؔ،سلیمؔ،کے حالات زندگی سے واقف ہوں گے

3۔میرؔ،غالبؔ،فراقؔ،مجازؔ،بشرؔ،سلیمؔ،کی غزل نگاری غزل پر تبصرہ کر سکیں گے

4۔میرؔ،غالبؔ،فراقؔ،مجازؔ،بشرؔ،سلیمؔ،کی غزلوں کی تشریح کر سکیں گے۔

2.2۔ تمہید:

میرؔ،غالبؔ،فراقؔ،مجازؔ،بشرؔنواز، سلیمؔ محی الدین اردو شاعری کے معروف شعرا ہیں۔اس اکائی میں ان شعرا کے غزلوں کا مطالعہ کیا جائے گا۔درجہ بالا شعرا کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کی جائے گیں۔ان شعرا کی غزلوں کے چند اشعار کی تشریح بطور نمونہ پیش کی جائے گی تاکہ طلبہ خود باقی اشعار کی تشریح کر سکیں،امید ہے اس اکائی کے مطالعے کے بعد ان شعرا سے متعلق آپ کی بنیادی معلومات میں اضافہ ہو سکے گا۔

2.3۔ موضوع کی وضاحت

2.3.1۔میر تقی میرؔ

غزل(۱)

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا — دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

قسم جو کھایئے تو طالع زلیخا کی — عزیز مصر کا بھی صاحب اک غلام لیا

وہ کج روش نہ ملا راستے میں مجھ سے کبھی — نہ سیدھی طرح سے ان نے مرا سلام لیا

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں — تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میرؔ — پہ میرے شور نے روے زمیں تمام لیا

غزل(۲)

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے	جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں	جی کے زیاں کو عشق میں اس کے اپنا وارا جانے ہے
چارہ گری بیماری دل کی رسم شہر حسن نہیں	ورنہ دلبر ناداں بھی اس درد کا چارہ جانے ہے
مہر و وفا و لطف و عنایت ایک سے واقف ان میں نہیں	اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارہ جانے ہے
عاشق تو مردہ ہے ہمیشہ جی اٹھتا ہے دیکھے اسے	یار کے آ جانے کو یکایک عمر دوبارہ جانے ہے
کیا کیا فتنے سر پر اس کے لاتا ہے معشوق اپنا	جس بے دل بے تاب و تواں کو عشق کا مارا جانے ہے
تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا میر سمجھی ناداں تلخی کش	دم دار آب تیغ کو اس کے آب گوارا جانے ہے

2.3.2۔ مرزا غالبؔ

غزل(ا)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا	اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا	کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو	یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح	کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا	نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالبؔ	تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غزل(۲)

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں	خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل	انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے	لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے	آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے	لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں
غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا	وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

2.3.3۔ فراقؔ گورکھپوری

غزل(۱)

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں	تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں
طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں	ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں
خود اپنا فیصلہ بھی عشق میں کافی نہیں ہوتا	اسے بھی کیسے کر گزریں جو دل میں ٹھان لیتے ہیں
جسے صورت بتاتے ہیں پتہ دیتی ہے سیرت کا	عبارت دیکھ کر جس طرح معنی جان لیتے ہیں
تجھے گھاٹا نہ ہونے دیں گے کاروبار الفت میں زمانہ واردات قلب سننے کو ترستا ہے	ہم اپنے سر ترا اے دوست ہر احسان لیتے ہیں اسی سے تو سر آنکھوں پر مرا دیوان لیتے ہیں
فراقؔ اکثر بدل کر بھیس ملتا ہے کوئی کافر	کبھی ہم جان لیتے ہیں کبھی پہچان لیتے ہیں

غزل(۲)

نرم فضا کی کروٹیں دل کو دکھا کے رہ گئیں	ٹھنڈی ہوائیں بھی تری یاد دلا کے رہ گئیں
شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس	دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں
حسن نظر فریب میں کس کو کلام تھا مگر	تیری ادائیں آج تو دل میں سما کے رہ گئیں
تیرے خرام ناز سے آج وہاں چمن کھلے	فصلیں بہار کی جہاں خاک اڑا کے رہ گئیں
تاروں کی آنکھ بھی بھر آئی میری صدائے درد پر	ان کی نگاہیں بھی ترا نام بتا کے رہ گئیں
یاد کچھ آئیں اس طرح بھولی ہوئی کہانیاں	کھوئے ہوئے دلوں میں آج درد اٹھا کے رہ گئیں
ساز نشاط زندگی آج لرز لرز اٹھا	کس کی نگاہیں عشق کا درد سنا کے رہ گئیں
تم نہیں آئے اور رات رہ گئی راہ دیکھتی	تاروں کی محفلیں بھی آج آنکھیں بچھا کے رہ گئیں
کون سکون دے سکا غم زدگان عشق کو	بھیگتی راتیں بھی فراقؔ آگ لگا کے رہ گئیں

2.3.4۔اسرار الحق مجازؔ

غزل(۱)

کمال عشق ہے دیوانہ ہو گیا ہوں میں	یہ کس کے ہاتھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں
تمہیں تو ہو جسے کہتی ہے ناخدا دنیا	بچا سکو تو بچا لو کہ ڈوبتا ہوں میں
اس اک حجاب پہ سو بے حجابیاں صدقے	جہاں سے چاہتا ہوں تم کو دیکھتا ہوں میں
بتانے والے وہیں پر بتاتے ہیں منزل	ہزار بار جہاں سے گزر چکا ہوں میں
کبھی یہ زعم کہ تو مجھ سے چھپ نہیں سکتا	کبھی یہ وہم کہ خود بھی چھپا ہوا ہوں میں
مجھے سنے نہ کوئی مست بادۂ عشرت	مجازؔ ٹوٹے ہوئے دل کی اک صدا ہوں میں

غزل(۲)

شوق کے ہاتھوں اے دل مضطر کیا ہونا ہے کیا ہوگا	عشق تو رسوا ہو ہی چکا ہے حسن بھی کیا رسوا ہوگا
حسن کی بزم خاص میں جا کر اس سے زیادہ کیا ہوگا	کوئی نیا پیاں باندھیں گے کوئی نیا وعدہ ہوگا
چارہ گری سر آنکھوں پر اس چارہ گری سے کیا ہوگا	درد کہ اپنی آپ دوا ہے تم سے کیا اچھا ہوگا
واعظ سادہ لوح سے کہہ دو چھوڑے عقبیٰ کی باتیں	اس دنیا میں کیا رکھا ہے اس دنیا میں کیا ہوگا
تم بھی مجاز آنسان ہو آخر لاکھ چھپاؤ عشق اپنا	یہ بھید مگر کھل جائے گا یہ راز مگر افشا ہوگا

2.3.5۔بشر نواز

غزل(۱)

چپ چاپ سلگتا ہے دیا تم بھی تو دیکھو	کس درد کو کہتے ہیں وفا تم بھی تو دیکھو
کس طرح کناروں کو ہے سینے سے لگائے	ٹھہرے ہوئے پانی کی ادا تم بھی تو دیکھو
یادوں کے سمن زار سے آئی ہوئی خوشبو	دامن میں چھپالائی ہے کیا تم بھی تو دیکھو
کچھ رات گئے روز جو آتی ہے فضا سے	ہر دل میں ہے اک زخم چھپا تم بھی تو دیکھو
ہر ہنستے ہوئے پھول سے رشتہ ہے خزاں کا	ہر دل میں ہے اک زخم چھپا تم بھی تو دیکھو
کیوں آنے لگیں سانس میں گہرائیاں سوچو	کیوں ٹوٹ چلے بند قبا تم بھی تو دیکھو

غزل(۲)

ہر نئی رت میں نیا ہوتا ہے منظر میرا	ایک پیکر میں کہاں قید ہے پیکر میرا
میں کہاں جاؤں کہ پہچان سکے کوئی مجھے	اجنبی مان کے چلتا ہے مجھے گھر میرا
جیسے دشمن ہی نہیں کوئی مرا اپنے سوا	لوٹ آتا ہے مری سمت ہی پتھر میرا
جو بھی آتا ہے وہی دل میں سما جاتا ہے	کتنے دریاؤں کا پیاسا ہے سمندر میرا
تو وہ مہتاب تکیں راہ اجالے تیری	میں وہ سورج کہ اندھیرا ہے مقدر میرا

2.3.6۔ سلیم محی الدین

غزل(۱)

آئینوں سے دھول مٹانے آتے ہیں	کچھ موسم تو آگ لگانے آتے ہیں
نیند تو گویا ان آنکھوں کی دشمن ہے	مجھ کو پھر بھی خواب سہانے آتے ہیں
ان آنکھوں میں رنگ تمہارے کھلتے ہیں	یہ موسم کب پھول کھلانے آتے ہیں
رونا ہنسنا ہنسنا رونا عادت ہے	ہم کو بھی کچھ درد چھپانے آتے ہیں
شبنم شبنم خواب اترتے ہیں مجھ پر	سو سو سورج دھوپ اگانے آتے ہیں
جسم دکاں ہے ذہن بکاؤ شہروں میں	جنگل تو دو چار دوانے آتے ہیں

غزل(۲)

زندگی جب اڑان بھر دینا	حوصلہ آسمان بھر دینا
عکس چہروں کو جب عطا کرنا	آئینوں میں گمان بھر دینا
اس کی تصویر میں اتاروں جب بھی	میرے مولا تو جان بھر دینا
ہم چراغوں کو زندگی دینگے	تم ہواؤں کے کان بھر دینا
اے گناہوں کو بخشنے والے	ہر سزا امتحان بھر دینا

2.4۔ مشقی سوالات

۱۔ میرؔ کی غزل گوئی پر اظہار خیال کیجیے؟

۲۔ غالبؔ کی غزل گوئی کے امتیازات بیان کیجیے؟

۳۔ مجازؔ کی غزلوں کا اجمالی جائزہ لیجئے؟

۴۔ فراقؔ کی غزل گوئی پر روشنی ڈالیے؟

۵۔ بشر نواز کے حالات زندگی بیان کیجئے؟

۶۔ سلیم محی الدین کی غزل گوئی پر اپنی رائے قائم کیجئے؟

۷۔چند شعروں کی تشریح:

دایم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں　　　　خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

غالب اس شعر میں محبوب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس زندگی سے تو پتھر ہونا بہتر تھا کہ شاید تیرا سنگ در ہونا اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ہمیشہ پتھر کی طرح پڑا تو رہتا ہوں، لیکن دریا سے دور ہوں میں پتھر نہیں ہوں کہ اس طرح پڑا رہنا گوارا کروں۔

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے　　　　لوحِ جہاں پر حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

اس شعر میں غالب کا مضمون تو یہ ہے کہ اپنے مٹنے کو حرفِ غلط کے مٹنے سے تشبیہ دی ہے، لیکن اگر یوں کہتے کہ زمانہ مجھے حرفِ غلط کی طرح مٹائے دیتا ہے تو اس قدر بلیغ نہ ہوتا جس قدر کہ اب بلیغ ہے اور بلاغت کی وجہ زیادتی معنی ہے، یعنی اب اتنے معنی اور بڑھے ہوئے ہیں کہ باوجود یہ کہ میں حرفِ مکرر نہیں ہوں اور کوئی وجہ میرے مٹانے کی نہیں ہے، زمانہ مجھے مٹا رہا ہے، اس شعر سے یہ نکتہ سمجھنا چاہئے کہ ایک تشبیہ مبتذل میں زیادتی معنی پیدا کرنے کا کیا طریقہ ہے اور پھر زیادتی معنی سے کس قدر بلاغت بڑھ جاتی ہے۔

قسم جو کھایئے تو طالعِ زُلیخا کی　　　　عزیزِ مصر کا بھی صاحب ایک غلام لیا

تشریح: مندرجہ بالا شعر میں شاعر نے حُسن تلمیح سے کام لیتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کے مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نہایت حسین و جمیل تھے۔ آپ سے حسد کی وجہ سے آپ کے بھائی آپ کو جنگل میں ایک کنویں میں پھینک آتے ہیں۔ وہاں سے گزرنے والا ایک قافلہ آپ کو کنویں سے نکال کر غلام بنا لیتا ہے اور مصر کے بازاروں میں خرید و فروخت کے لئے لے جاتا ہیں۔ وہاں کا ایک عزیز اُس غلام کو اپنی بیوی زلیخا کے لئے خرید لیتا ہے تاکہ گھر کے کام کاج میں اُس کی مدد کرے۔ زلیخا جو ایک قابلِ مذمت کردار کی مالکہ تھی حضرت یوسف علیہ السلام میں دلچسپی لینے لگتی ہے اور اُنہیں دعوتِ گناہ قبول نہ کرنے کے جرم میں جیل میں قید کروا دیتی ہے۔ جب یہ مسئلہ عزیزِ مصر کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاکیزہ کردار سے بہت متاثر ہوتا ہے اور اُنہیں اپنے منصب پر فائز کر دیتا ہے۔

شاعر اس واقعہ کی روشنی میں زُلیخا کی قسمت کو قابلِ رشک اور بلند کہہ رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ زُلیخا وہ خوش قسمت عورت ہے جس کے گھر آنے والا ایک غلام بادشاہت کے بلند ترین منصب پر فائز ہو جاتا ہے اور زلیخا کو ہمیشہ کے لئے اُن کی قربت حاصل ہو

جاتی ہے۔ زلیخا کے نصیب سے متاثر ہو کر شاعر کہتا کہ محبوب کا حصول ہی سب سے اچھی قسمت ہے۔ اس لئے اگر قسم کھانی ہو تو ہمیں عزیزِ مصر کی بیوی کی کھانی چاہئے جس کے بخت کی بدولت اُسے حضرت یوسف علیہ السلام جیسے جمیل انسان کا حصول ہوا۔

مزا د کھاویں گے بے رحمی کا تیری صّیاد　　　　گر اضطرابِ اسیری نے زیرِ دام لیا

تشریح

شاعر نے اس شعر میں تمثیلی اندازِ بیان اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ کو ایک مظلوم اور بے کس پرندہ ظاہر کیا ہے جو شکاری کی قید میں ظلم و جبر کا نشانہ بن رہا ہے۔ شاعر اپنے محبوب سے ہمکلام ہو کر کہتا ہے کہ ہم تیری محبت کے پنجرے میں قید ہیں اور تو ہم پر مسلسل ستم ڈھا رہا ہے۔ وہ مخاطب کرتا ہے کہ اے صّیاد! تو نے ہم پر بہت ستم کر لئے اور ہم کو بہت جبر کا نشانہ بنا لیا۔ تو ایک بے رحم اور بے حس شخص ہے جو ہم پر نہایت بے دردی سے اپنے حربے آزما رہا ہے۔ شاید تجھ کو اس بات کا احساس نہیں کہ اگر ہماری مظلومیت اور تیرے تکلیف دہ افعال برداشت کی حد پار کر گئے تو ہم تجھ کو تیری اِن ظالمانہ حرکتوں کو خوب مزہ چکھائیں گے اور تجھ سے اپنی بے کسی کا بدلہ لیں گے۔ اگرچہ ہم قید ہیں لیکن ہم کو صیاد سے بدلہ لینا آتا ہے۔ ہم خود ہی اپنے جسم سے روح کو علیحدٰہ کر دیں گے اور تجھ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بے چینی، بے قراری اور اضطراب کے بھنور میں پھنسا جائیں گے۔ تو ہم کو یاد کر کر کے اپنے دل کو تڑپائے گا اور تاموت خلش اور اذیت سے دوچار رہے گا۔ اِس لئے ہم کہتے ہیں کہ ہم پر ظلم و ستم اتنا کر جتنا تو برداشت کر سکیں ورنہ اِس کا انجام دونوں کے حق میں بہت برا ہو گا۔ اس شعر میں شاعر نے ایک خوبصورت حقیقت بیان کی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب جب اپنے چاہنے والے کا بہت کرخت اور مشکل امتحان لیتا ہے تو وہ امتحان میں کامیاب نہیں ہوتا اور محبوب سے دور ہو جاتا ہے۔ آخر کار محبوب اس کی یاد میں ہمیشہ بے قرار اور مضطرب رہتا ہے

2.5۔ خلاصہ

میرؔ، غالبؔ، فراقؔ، مجازؔ، بشرؔ نواز، سلیمؔ محی الدین اردو شاعری کے معروف شعرا ہیں۔ اس اکائی میں ان شعرا کے غزلوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان شعرا کی غزلوں کے چند اشعار کی تشریح بطور نمونہ پیش کی جائے گی تا کہ طلبہ خود باقی اشعار کی تشریح کر سکیں، امید ہے اس اکائی کے مطالعے کے بعد ان شعرا سے متعلق آپ کی بنیادی معلومات میں اضافہ ہوا ہو گا۔

2.6۔الفاظ و معنی

1۔ مہتاب بکف	چاند ہات میں لئے
2۔ سمن زار	چنبیلی کا تختہ یا باغ
3۔چارہ گری	علاج، مدد، اعانت
4۔ خرام ناز	متوالی چال، نخروں والی چال
5۔ تیر نیم کش	ادھ کھلی آنکھ کا تیر

2.7۔سفارش کردہ کتب

1۔دیوانِ میرؔ۔۔۔۔۔۔۔۔میر تقی میرؔ

2۔دیوان غالبؔ۔۔۔۔۔۔۔مرزا غالبؔ

3۔دیوان مجازؔ۔۔۔۔۔۔۔۔اسرار الحق مجازؔ

4۔دیوان فراقؔ۔۔۔۔۔۔۔فراقؔ گورکھ پوری

5۔رائگاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔بشر نوازؔ

6۔وابستہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سلیم محی الدین

7۔تاریخ ادب اردو۔۔۔۔۔نورالحسن نقوی

8۔مختصر تاریخ ادب اردو۔۔۔سیدہ جعفر

9۔نیا ادب نئے مسائل۔۔۔۔بشر نوازؔ

اکائی: 3۔درج ذیل شعرا کا تعارف اور ان کی غزل گوئی کا مطالعہ

3.1۔ مقصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ ۔۔۔

1۔میرؔ،غالبؔ،فراقؔ،مجازؔ،بشرؔنواز، سلیمؔ محی الدین،کے حالات زندگی سے واقف ہوں گے

2۔میرؔ،غالبؔ،فراقؔ،مجازؔ،بشرؔنواز، سلیمؔ محی الدین کی غزل گوئی سے واقف ہوں گے

3۔میرؔ،غالبؔ،فراقؔ،مجازؔ،بشرؔنواز، سلیمؔ محی الدین کی غزل گوئی کی خاصیت سے واقف ہوں گے

4۔میرؔ،غالبؔ،فراقؔ،مجازؔ،بشرؔنواز، سلیمؔ محی الدین کی غزلوں پر خود اظہار خیال کر سکیں گے۔

3.2۔ تمہید:

میرؔ،غالبؔ،فراقؔ،مجازؔ،بشرؔنواز، سلیمؔ محی الدین اردو شاعری کے معروف شعرا ہیں۔اس اکائی میں ان شعرا کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی جائے گی۔درجہ بالا شعرا کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کی جائے گیں۔امید ہے اس اکائی کے مطالعے کے بعد ان شعرا سے متعلق آپ کی بنیادی معلومات میں اضافہ ہو گا۔

3.3۔موضوع کی وضاحت

3.3.1۔میر تقی میرؔ

میر تقی میر، آگرہ میں 1723ء میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام محمد علی تھا لیکن علی متقی کے نام سے مشہور تھے۔اور درویش گوشہ نشین تھے۔میر نے ابتدائی تعلیم والد کے دوست سید امان اللہ سے حاصل کی مگر مزید تعلیم سے پہلے جب میر ابھی نو برس کے تھے وہ چل بسے تب ان کے بعد ان کے والد نے خود تعلیم و تربیت شروع کی۔ مگر چند ماہ بعد ہی ان کا بھی انتقال ہو گیا۔یہاں سے میر کی زندگی میں رنج والم کے طویل باب کی ابتدا ہوئی۔

ان کے سوتیلے بھائی محمد حسن نے اچھا سلوک نہ کیا۔ تلاش معاش کی فکر میں دہلی پہنچے اور ایک نواب کے ہاں ملازم ہو گئے۔ مگر جب نواب موصوف ایک جنگ میں مارے گئے تو میر آگرہ لوٹ آئے۔ لیکن گزر اوقات کی کوئی صورت نہ بن سکی۔ چنانچہ دوبارہ دہلی روانہ ہوئے اور اپنے خالو سراج الدین آرزو کے ہاں قیام پزیر ہوئے۔ سوتیلے بھائی کے اکسانے پر خان آرزو نے بھی پریشان کرنا شروع کر دیا۔ کچھ غم دوراں، کچھ غم جاناں سے جنوں کی کیفیت پیدا ہو گئی میر کا زمانہ شورشوں اور فتنہ و فساد کا زمانہ تھا۔ ہر طرف تنگدستی و مشکلات برداشت کرنے کے بعد بالآخر میر گوشہ عافیت کی تلاش میں لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ اور سفر کی صعوبتوں کے بعد لکھنؤ پہنچے۔ وہاں ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی۔ نواب آصف الدولہ نے تین سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور میر آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن تند مزاجی کی وجہ سے کسی بات پر ناراض ہو کر دربار سے الگ ہو گئے۔ آخری تین سالوں میں جوان بیٹی اور بیوی کے انتقال نے صدمات میں اور اضافہ کر دیا۔ آخر اقلیم سخن کا یہ حرماں نصیب شہنشاہ 87 سال کی عمر پا کر 1810ء میں لکھنؤ کی آغوش میں ہمیشہ کے لیے سو گیا۔ میر کی زندگی کے بارے میں معلومات کا اہم ذریعہ ان کی سوانح عمری "ذکرِ میر"، جو ان کے بچپن سے لکھنؤ میں ان کے قیام کے آغاز کی مدت پر محیط ہے۔

میر کا دور شدید ابتری کا دور تھا۔ زندگی کے مختلف دائروں کی اقدار کی بے آبروئی ہو رہی تھی۔ انسانی خون کی ارزانی، دنیا کی بے ثباتی اور ہمہ گیر انسانی تباہی نے انسانوں کو بے حد متاثر کیا۔ میر اس تباہی کے محض تماشائی نہ تھے بلکہ وہ خود اس تباہ حال معاشرہ کے ایک رکن تھے۔ جو صدیوں کے لگے بندھے نظام کی بربادی سے تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر کر رہ گیا تھا۔ اور اب اس کو جوڑنا ممکن نہ رہا تھا۔ میر نے اس ماحول کے اثرات شدت سے محسوس کیے ہیں۔ ان کی غزلوں میں اس تباہی کے نقوش ملتے ہیں۔ لٹے ہوئے نگروں، شہروں اور اجڑی ہوئی بستیوں کے حالات، بجھے ہوئے دلوں کی تصویریں، زمانے کے گرد و غبار کی دھندلاہٹیں، تشبیہوں اور استعاروں کی شکل میں میر کے ہاں موجود ہیں۔ بطور مثال ان کے کلام کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

روشن ہے اس طرح دلِ ویراں میں داغ
ایک اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

پتاپتا بوٹابوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

دل کی ویرانی کا کیا مذکور
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

3.3.2۔ مرزا غالب

نجم الدولہ، دبیر الملک، مرزا نوشہ اسد اللہ خان غالب بہادر نظام جنگ (1797ء-1869ء) اردو زبان کے سب سے بڑے شاعروں میں ایک سمجھے جاتے ہیں۔ یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ 19 ویں صدی غالب کی صدی ہے۔ جبکہ 18 ویں میر تقی میر کی تھی اور 20 ویں علامہ اقبال کی۔ غالب کی عظمت کا راز صرف ان کی شاعری کے حسن اور بیان کی خوبی ہی میں نہیں ہے۔ ان کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کے حقائق اور انسانی نفسیات کو گہرائی میں جاکر سمجھتے تھے اور بڑی سادگی سے عام لوگوں کے لیے بیان کر دیتے تھے۔ غالب جس پر آشوب دور میں پیدا ہوئے اس میں انہوں نے مسلمانوں کی ایک عظیم سلطنت کو برباد ہوتے ہوئے اور باہر سے آئی ہوئی انگریز قوم کو ملک کے اقتدار پر چھاتے ہوئے دیکھا۔ غالباً یہی وہ پس منظر ہے جس نے ان کی نظر میں گہرائی اور فکر میں وسعت پیدا کی۔

مشہور قول کے مطابق غالب 27 دسمبر 1797ء کو کالا محل، آگرہ میں پیدا ہوئے۔ مشہور پاکستانی ماہر فلکیات سید صمد حسین رضوی (متوفی 2009ء) کی تحقیق کے مطابق غالب 8 جنوری 1797ء کو پیدا ہوئے تھے۔

1802ء میں والد کی وفات کے بعد غالب کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خان اُن کے سرپرست بنائے گئے جو مرہٹوں کی جانب سے آگرہ کے قلعہ دار تھے۔ 18 اکتوبر 1803ء کو جب آگرہ پر انگریزی افواج نے حملہ کیا تو مرزا نصر اللہ بیگ خان نے قلعہ آگرہ لارڈ لیک کے حوالے کر دیا جس پر انگریزی افواج آگرہ میں داخل ہو گئیں اور مرہٹوں کا اثر ختم ہو گیا۔ لارڈ لیک نے مرزا نصر اللہ بیگ خان کو 1700 روپے مشاہدے کے ساتھ چار سو گھڑ سواروں کا رِسالدار مقرر کر دیا۔ اپریل 1806ء میں مرزا نصر اللہ بیگ خان ہاتھی سے گر کر زخمی ہوئے اور انتقال کر گئے۔ اُن کے پسماندگان میں غالب اور اُن کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف علی بیگ خان بھی شامل تھے۔ 4 مئی 1806ء کو نواب احمد بخش خان، نواب ریاست فیروز پور جِھرکا نے انگریزوں سے سفارش کر کے پسماندگان کا وظیفہ دس ہزار روپے مقرر کروا دیا جس میں غالب کی دادی، تین پھوپھیاں اور چھوٹا بھائی بھی شامل تھا۔ 7 جون 1806ء کو وظیفہ کی یہ رقم دس ہزار سے کم کر کے پانچ ہزار کر دی گئی۔

ابتدائی ماخذوں سے پتا چلتا ہے کہ غالب کی شعر گوئی کا آغاز 1807ء سے ہوا اور اولین تخلص اسد تھا لیکن بعد ازاں اُنہوں نے ایک اور شاعر میر اَمانی اسد سے کلام کی مشابہت کے بعد اپنا تخلص غالب اختیار کر لیا تاہم شاعری میں کبھی کبھی اسد بطور تخلص کے ملتا ہے۔ 1816ء سے غالب بطور تخلص کے استعمال کرنا شروع کیا جو تا وقت آخر جاری رہا۔

مرزا غالب نے پہلے تو 'اسد' تخلص اختیار کیا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ایک اور دوسرے شاعر ہیں، جن کا تخلص اسد ہے، تو مرزا نے اسے ترک کر کے ''غالب'' تخلص اپنایا جو آخری دم تک رہا۔ غالب آگرے کے مشہور و معروف رئیس خاندان میں 27 دسمبر 1797 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مرزا عبید اللہ بیگ اور ماں کا عزت النساء بیگم تھا جو مرزا غلام حسین کی بیٹی

تھی۔ابتدائی زندگی سے ہی غالب کو آزمائشوں کا سامنا رہا ہے۔جب 5 سال کے تھے تو والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا،آپ کے والد بہت جواں مرد شخص تھے۔یہی وجہ تھی کے مختلف درباروں سے منسلک رہے۔پہلے دربارِ اودھ سے جڑے پھر حیدآباد کے نواب نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں ملازم رہے اور پھر راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی،''الور''میں ایک جنگ کے دوران دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔والد کے انتقال کے بعد پرورش اور تعلیم کی ذمے داری چچانے قبول کی،مگر زندگی کے سفر میں یہ بھی مکمل ساتھ نہ دے سکے۔مختلف روایتوں کے مطابق 89 سال ہی میں یہ سفرِ زندگی سے الگ ہو کر دارِ فانی کی طرف کوچ کر گئے۔

مرزا کی شادی 13 سال کی عمر میں نواب الٰہی بخش خان معروف کی بیٹی امرائو بیگم سے ہوئی۔اس کے دو سال بعد یہ 1812ء میں اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر دہلی میں آکر سکونت پذیر ہو گئے۔یہ نقل مکانی غالب کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی، کیوں کہ یہاں علم دوست حضرات سے ملنے کا انھیں خوب موقع ملا،جس کی وجہ سے ان کی اندرونی صلاحیت خوب اجاگر ہوئی۔ غالب بلا کی ذکاوت وذہانت رکھتے تھے،جس کا اندازہ اس سے بخوبی کیا جاسکتا ہے:حسام الدین حیدر نے ایک بار ان کا کلام میر کے سامنے پیش کیا۔ان کے کلام کو پڑھ کر میر نے کہا،اگر اچھا استاد مل گیا تو لاجواب شاعر بنے گا۔یہ 1810ء کا واقعہ ہے اور اس وقت غالب کی عمر 13 سال تھی۔سفرِ کلکتہ غالب کی زندگی کا ایک پر آشوب حصہ ہے،جس میں آرام کے آشیانے دور دور تک نظر نہیں آتے۔اس کا ایک جائزہ ہم مولانا حالی کی تحریر سے پیش کرتے ہیں:

جب مرزا کے چچانے وفات پائی اس وقت ان کی عمر 9 سال کی تھی۔انگریزوں نے جو پنشن ان کے خاندان کے لیے مقرر کی،وہ ریاست فیروز پور جھرکہ سے ملتی تھی۔جب تک وہ صغر سن رہے اور جو کچھ وہاں سے ملتا رہا وہ اس پر قانع رہے، مگر شادی کے بعد ان کی خانگی ضروریات بہت بڑھ گئیں اور وہ مقروض ہو گئے۔مرزا کو صحیح یا غلط یہ خیال پیدا ہوا کہ ریاست سے جس قدر پنشن ملنی چاہیے وہ مجھے نہیں ملتی ہے۔لہٰذا کلکتہ پہنچ کر حکومت عالیہ میں استغاثہ کرنا لازمی ہے۔

مرزا غالباً 1826 میں دہلی سے روانہ ہوے اور کان پور ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔جہاں مرزا کی بہت عزت ہوئی اور نوابوں نے ان کے استقبال پر ایک مشاعرہ بھی منعقد کیا۔اس مشاعرہ میں غالب نے بھی غزل پڑھی تھی جس کا مطلع یہ ہے۔

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو

صدرِ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

ایک سال کے بعد پھر لکھنؤ سے کان پور،بنارس اور پٹنہ ہوتے ہوئے کلکتے جانے کا عزم کیا اور قسمت نے ''بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے''پر لا کھڑا کر دیا اور جس مقصد کے لیے کلکتہ گئے تھے،بقول اس مصرع کے:

کوئی امید بر نہیں آتی

ڈیڑھ سال سے زیادہ قیام کے بعد بے مراد ہو کر یہ نومبر 1829 میں دہلی واپس آگئے۔ان کی زندگی کی تلخیوں کا اندازہ ان کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

خصوصیات کلام غالب کے کچھ پیرائے جس نے غالب کو غالب بنایا اور آج تک اردو شاعری کی دنیا میں غالب غالب ہی ہیں کبھی مغلوب نہیں ہوئے ذیل میں ذکر کیے جاتے ہیں:

انداز بیاں: اس سے غالب کے کلام کی منزلت میں چار چاند لگ گیا، جیسا کہ خود انھوں نے اپنے کلام میں اشارہ کیا ہے۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

دشوار پسندی: غالب کے کلام میں دشوار پسندی کبھی استعاروں کی شکل میں تو کبھی کنایوں کی شکل میں اور کبھی مشکل الفاظ کی بندش میں موجود ہے۔

رمز: اس کو کہتے ہیں جس میں ملزوم تک پہنچنے کے لیے بہت واسطے نہ ہو مگر کچھ خفا ہو۔

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

شاعر نے اپنی بات کو استفہام کے پردے میں کہا ہے کہ عشق ایک لاعلاج بیماری ہے۔

ظرافت: کبھی مزاح کی شکل میں۔۔۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

اور کبھی طنز کی شکل میں۔۔۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمہاری شراب طہور میں

اردو شاعری میں جدت پسندی کی امامت و پیشوائی کا سہرا غالب کے سر بندھتا ہے، کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ غالب سے پہلے کسی نے جدت کی راہ اختیار نہیں کی۔ غالب فطری طور پر چوں کہ فلسفیانہ ذہن لے کر پیدا ہوئے تھے، اس لیے وہ مقتدی کی حیثیت سے شاعری کی دنیا میں بھلا اپنی پہچان کیوں کر بناتے؟ یہ ان کے ضمیر کو گوارہ نہ تھا اس لیے وہ اردو کی بے آب و گیاہ میدان میں اپنی جدت طرازی خیالات آفرینی، فکری بلندی اور ذہنی ہم آہنگی سے ایسی آب یاری کی کہ اس میدان کے مقتدیٰ اور امام تسلیم کیے گئے۔ غالب کی جبلت میں فلسفیانہ خیال داخل ہونے کی وجہ سے ان کے ذہن و فکر کی سمت جدھر مڑی صدہا خصوصیات پر مبنی اشعار وجود میں آگئے۔ ذیل کے اشعار میں بخوبی فلسفیانہ مسائل آپ کی پرواز فکر اور فاضلانہ رنگ بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا!

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا ہے کہ یگانہ ہے وہ یکتا　　جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے　　پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

نظر میں ہے ہماری جادہ راہِ فنا غالب　　کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

غم ہستی اسد کس سے ہو جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غالب نے قدیم روش پر چلنا بالکل پسند نہ کیا۔اس لیے انھوں نے ایک الگ اچھوتی راہ پر اپنے آپ کو ڈھالا اور ان کے مزاج کی اس نفاست وندرت پسندی نے اردو غزل کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔اس سے پہلے غزل عاشقانہ مضامین کے بوجھ تلے سانسیں لے رہی تھی۔بیچاری کیا کر بھی سکتی تھی۔ہر طرف عاشقوں کا بول بالا تھا اور یہ حضرات محبت و نفرت کی بھڑاس نکالنے کے لیے اسی کو ذریعہ وآلہ بنالیے تھے۔پھر اس کی ملاقات زمانے کے ستائے ہوئے ایک دل کے دھنی شخص سے ہوئی۔جس نے اس کو مختلف رنگوں سے سجایا اور نکھارا۔

مضمون طویل نہ ہو اس لیے خیالاتِ غالب کی چند جھلکیوں پر ہی اکتفا کیا جارہا ہے۔اہل ذوق مزید تشنگی بجھانے کے لیے دیوان غالب کے میخانے کے جام لبالب سے اپنے آپ کو مست کر سکتے ہیں:

آرزوئے فیضان الٰہی: غالب کے اس شعر میں خوبصورت اور پاکیزہ خیال ہے

زکوٰۃ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا　　چراغِ خانہ درویش ہو کاسہ گدائی کا!

شعر میں محبوب حقیقی مراد ہے۔غالب خدا کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔اپنی صفات کی تجلیاں میرے دل میں ڈال دے تا کہ ان کے انوار سے میری شخصیت آفتاب کی طرح روشن ہو جائے۔

طاقت عشق:

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی　　یہ جنوں عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

وفور انتظار آمد ساقی: غالب نے اس شعر میں ساقی کے انتظار کو قیامت برپا ہونے سے تعبیر کیا ہے

شب خمار شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا　　تا محیط بادہ، صورت خانۂ خمیازہ کا

شب ہجر کی دشواری: عاشق کا شب ہجر بسر کرنا کتنا دشوار ہے، ہم اس شعر سے اندازہ کر سکتے ہیں۔

کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ　　صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

اعتدال کی تعلیم: آج اس پر فتن دور میں مسلک و مشرب کے نام پر اپنے آپس میں جو تفرقہ ہے، غالب کے اس شعر سے کچھ درس حاصل کرنا چاہیے

آزاد رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل　　ہر گز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

یوں تو وحدت الوجود اور وحدت الشہود ان دونوں نظریوں کا ذکر صوفیہ کی شاعری اور ان کے ملفوظات میں بہت پایا جاتا ہے۔ صوفیہ کی شاعری میں اور ان کے ملفوظات میں پانے کی ایک بڑی وجہ تصوف سے لگاؤ ہے، مگر کچھ حضرات ایسے بھی گزرے ہیں جن کی زندگی میں اگرچہ تصوف کا رنگ کچھ نہیں رہا مگر ان کی شاعری میں یہ رنگ بخوبی ملتا ہے۔ تو پھر غالب کیوں کر اس میدان میں پیچھے رہتے، انھوں نے بھی اس رنگ میں شاعری کی۔

نظریہ وحدت الشہود:

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسانے، ورنہ یاں ذرہ ذرہ روکشِ خورشید عالم تاب تھا

شوخیِ محبوب:

درپر رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا!

تاریکیِ شب غم:

کیوں اندھیری ہے شب غم؟ ہے بلاؤں کا نزول آج ادھر ہی کو رہے گا، دیدۂ اختر کھلا

غالب اپنی انفرادیت کی وجہ سے روز قیامت تک زندہ رہیں گے، ہم اردو داں طبقے اور دیگر دیوانگانِ غالب سے امید رکھتے ہیں کہ ان کے آنے والے 150 سالہ برسی پر ایک نئے زاویے سے ان پر کام ہو اور ان کے فلسفیانہ افکار و خیالات اور زریں پیغامات، انسان دوستی، رواداری اور اعتدال پسندی کو عام کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ہدایات پر عمل درآمد بھی ہو۔ کوئی ایسا ٹرسٹ ان کے نام سے کھلے جو ایسے ادیب کی مدد کرے جو مالی اعتبار سے پریشان حال ہے یا آخری عمر میں جن کا کوئی سہارا نہیں۔

آج جب بٹلہ ہاؤس کی بھیڑ میں اسرار جامعی کو ٹھوکر کھاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی ان کا اس دنیا میں نہیں اور اردو داں طبقے کے نزدیک بھی ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ مگر یہی اردو والے جب یہ درد کا مارا انسان اس دنیا کو الوداع کہہ دیتا ہے تو اس کے نام سے بڑے بڑے سیمینار کرتے ہیں۔ یہ انسان بھی عجیب ہے کہ انسانوں کی قدر ان کی زندگی میں نہیں مرنے کے بعد کرتا ہے، وہ شاید اس لیے کہ اس کے ذریعے اسے زر اور نام و نمود حاصل کرنا مقصود رہتا ہے۔ اے کاش! کوئی ایسا ہوتا جو نام و نمود سے ہٹ کر اس طرف دھیان دیتا۔

3.3.3۔ فراق گورکھپوری

فراق گورکھپوری (پیدائش: 28 اگست 1896ء—وفات: 3 مارچ 1982ء) مصنف، ادیب، نقاد اور شاعر تھے۔ اُن کا شمار بیسویں صدی کے اردو زبان کے صفِ اول کے شعرا میں ہوتا تھا۔ ان کا اصل نام رگھوپتی سہائے تھا۔ فراق پی سی ایس اور آئی سی ایس (انڈین سول سروس) کے لیے منتخب ہوئے تھے۔ لیکن گاندھی جی کی **تحریک عدم تعاون** کی مخالفت میں استعفیٰ دے دیا۔ جس کی پاداش میں انھیں جیل جانا پڑا۔ اس کے بعد وہ جامعہ الٰہ آباد میں انگریزی زبان کے

لیکچرر مقرر ہوئے۔ یہیں سے وہ دنیائے شعر وادب کے آسمان پر سورج بن کر چمکے اور ناچاہتے ہوئے بھی معاصرین کو ماننا پڑا کہ بلا شبہ فراق اور دیگر شعرا کی شاعری میں فرق تو ضرور ہے۔ فراق میں ایک انفرادیت تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو بطور شاعر منوا پائے۔ ان کی کی شہر آفاق کتاب **گل نغمہ** بھی اسی دوران منظر عام پر آئی۔ جس کو ہندوستان کا اعلیٰ معیار ادب گیان پیٹھ انعام بھی ملا۔ اور وہ آل انڈیا ریڈیو کے پروڈیوسر بھی رہے۔

بطور ممتاز شاعر انہوں نے اردو شاعری کی اہم اصناف مثلاً غزل، نظم، رباعی اور قطعہ میں کے وہ ایک منفرد شاعر ہیں جنہوں اردو نظم کی ایک درجن سے زائد اور اردو نثر کی نصف درجن سے زائد جلدیں ترتیب دیں اور ہندی ادبی اصناف پر متعدد جلدیں تحریر کیں، ساتھ ہی ساتھ انگریزی ادبی و ثقافتی موضوعات پر چار کتابیں بھی لکھی۔ جدید شاعری میں فراق کا مقام بہت بلند ہے۔ آج کے شاعری پر فراق کے اثر کو باآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بہترین شخصیت کے مالک تھے حاضر جوابی میں ان کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ بین الاقوامی ادب سے بھی شغف رہا۔ تنقید میں رومانی تنقید کی ابتدا فراق سے ہوئی۔

ان کے معاصرین میں شاعر مشرق علامہ اقبال، فیض احمد فیض، کیفی اعظمی، یگانہ یاس چنگیزی، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی اور ساحر لدھیانوی جیسے شاعر ہیں۔ اتنی عظیم ہستیوں کی موجودگی کے باوجود انہوں نے ابتدائے عمر میں ہی اپنی شاعری کا لوہا منوالیا۔ فراق کا انتقال طویل علالت کے بعد 3 مارچ 1982ء کو 85 سال کی عمر میں نئی دہلی میں ہوا۔ میت الہ آباد لے جائی گئی جہاں دریائے گنگا اور دریائے جمنا کے سنگم پر نذر آتش کیا گیا۔ راق کی غزل گوئی: فراق گورکھپوری نے ویسے تو شاعری کے مختلف اصناف کو برتا اور اس میں طبع آزمائی کی ہے، مگر وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل گو شعرا میں بھی ان کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جہنوں نے اپنی خلاقانہ ذہنیت، بے انتہا علوم اور حساس مزاجوں کو استعمال کر کے غزل میں نئے نئے گوشوں کا اضافہ کیا، ان کی غزلوں میں مشرقی لے بھی نظر آتی ہے اور مغربی بھی، انہوں نے اپنی غزلیہ شاعری میں آزادی کے بعد کے ہندوستانی فضا کی عکاسی جس خوبصورتی سے کی ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی، یہی وجہ ہے کہ اسلوب احمد انصاری جیسے ناقد نے انہیں ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کا ایک ممتاز نمائندہ قرار دیا، سید محمد عقیل رضوی نے عہد آفریں، مظہر امام نے کلاسیکی غزل کا آخری بڑا شاعر، رشید احمد صدیقی نے اردو غزل کا رمز آشنا کہا ہے۔

3.3.4۔ اسرار الحق مجازؔ

مجازؔ 19 اکتوبر 1911ء میں قصبہ رودولی ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ان کا حقیقی نام اسرار الحق اور مجازؔ تخلص اختیار کیا۔ مجازؔ نے 1935 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے کیا تھا۔ 1936 میں دہلی ریڈیو اسٹیشن سے شائع 'آواز' کے پہلے مدیر مجازؔ ہی تھے۔ انہوں نے کچھ وقت بمبئی انفارمیشن میں بھی کام کیا تھا اور پھر لکھنؤ آکر 'نیا ادب' اور 'پرچم' کی ادارت کی۔ اس کے بعد دہلی میں ہارڈنگ لائبریری سے منسلک ہوئے تھے۔ مجازؔ کی مختصر زندگی کا خاصہ ان کی شاعری تھی۔ ان

کی سب سے بہترین نظم 'آوارہ' ہے، جس کے چند بند 1953 میں بنی فلم 'ٹھوکر' میں گلوکار طلعت محمود کی آواز میں کافی مشہور ہوئے:

''اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں''

یہ شہر کی رات میں ناشاد و ناکارہ پھروں

جگمگاتی دوڑتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں

غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں

ادبی رکنیتیں مجاز انجمن ترقی پسند مصنفین کے رکن تھے۔ مجلس ادارت "نیا ادب" لکھنؤ اجرا 1939ء کے بھی رکن تھے۔ انتقال 3 دسمبر 1955 کو لکھنؤ میں مجاز ایک مشاعرے میں شامل ہوئے تھے۔ اس کے دو دن بعد یعنی 5 دسمبر 1955 کو وہ انتقال کر گئے تھے۔ ڈاک ٹکٹ 2008 میں ایک ڈاک ٹکٹ حکومتِ ہند کی جانب سے مجاز کی یاد میں جاری ہوا تھا۔

3.3.5۔ بشر نواز

بشر نواز 1935ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ انٹر میڈیٹ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ گریجویشن کے لئے حیدرآباد گئے تاہم انکی اعلی تعلیم مکمل نہ ہو سکی۔ حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں اپنی شخصیت اور اعلی شعری صلاحیتوں کے ذریعہ انہوں نے اپنی ایک خاص پہچان بنائی۔ حیدرآباد اور اورنگ آباد ان کے لئے گھر آنگن کی طرح تھے، ریلوے ٹکٹ 6 روپئے میں تھا، دونوں ہی شہروں میں اُن کے بہت سارے خاندان سکونت پذیر تھے۔ اس لئے آنے جانے کا سلسلہ جاری تھا۔ حیدرآباد سے ان کا بڑا گہرا لگاؤ رہا ہے، کیونکہ اس شہر میں ان کے بے شمار دوست رہتے تھے وہ اکثر عثمانیہ یونیورسٹی کے ہاسٹل میں ڈاکٹر وحید اختر کے ساتھ قیام کرتے تھے۔ ان دنوں حیدرآباد ملک میں شعر و ادب کا بڑا مرکز تھا۔ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کی شہرت کے باوجود حیدرآباد علم و ادب کا عظیم گہوارہ مانا جاتا تھا۔ حیدرآباد میں وحید اختر، شاذ تمکنت، سلیمان اریب، عزیز قیسی، سردار سلیم جیسے شعراء کے ساتھ ان کے شب و روز گذرتے۔ حیرت بدایونی، ڈاکٹر زینت ساجدہ، اقبال متین، حسینی شاہد اور کئی ادبی شخصیتوں سے ان کے دوستانہ روابط رہے۔

انہوں نے اپنے 60 سالہ شعری سفر میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے رجحانات کو براہ راست اپنی شاعری میں برتا ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے ''رائیگاں'' اور ''اجنبی سمندر'' منظر عام پر آچکے ہیں، جن کی بر صغیر ہند و پاک کے ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی۔ ان کے تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ''نیا ادب نئے مسائل'' بھی شائع ہو چکی ہے۔ دیوناگری رسم الخط میں بھی ان کا کلام شائع ہو چکا ہے۔

انہوں نے 1953 سے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور 1954ء ہی سے انہیں بڑے بڑے مشاعروں میں کلام سنانے کے لئے مدعو کیا جانے لگا۔ مشاعروں میں شرکت کی وجہ سے انھیں اس دور کے کئی نامور شعراء سے شرف نیاز کا موقع ملا، جن میں جوش ملیح آبادی، جاں نثار اختر، اختر الایمان وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مخدوم محی الدین کا ان پر احسان ہے کہ انہوں نے پہلی بار حیدرآباد کے مشاعرے میں انھیں متعارف کرایا۔ اس کے بعد سے وہ حیدرآباد کے ہر مشاعرے میں مدعو کئے جانے لگے ۔ان کے کلام کو باذوق سامعین نے ہمیشہ پسند کیا اور اپنی داد وستائش سے ان کے حوصلے بڑھائے۔

کوئی یادوں سے جوڑلے ہم کو ہم بھی اک ٹوٹا سا رشتہ ہیں

وہ اہتمام چراغاں بجا سہی لیکن سحر تو ہو نہیں سکتی دیئے جلانے سے

وہی ہے رنگ مگر بو ہے کچھ لہو جیسی یہ اب کی فصل میں کھلتے گلاب کیسے ہیں

پیار کے بندھن خون کے رشتے ٹوٹ گئے خوابوں کی طرح

جاگتی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کیا کیا کاروبار ہوئے

بشر نواز کا پہلا شعری مجموعہ "رائیگاں'' 1972ء میں اور تنقیدی مضامین پر مشتمل مجموعہ 1973ء میں شائع ہوا تھا. مختلف رسائل میں نقد و تبصرے شائع ہوتے رہے ہیں، جن سے ان کے تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے.

بشر نواز کی شاعری میں رومانیت کے ساتھ ساتھ عصری حسیت بھی پائی جاتی ہے. مرحوم نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور برتا ہے. بشر نواز کے حصے میں کئی اعزازات اور انعامات آئے. آپ کو ریاستی حکومت نے بھی ایوارڈ سے نوازا.

بشر نواز کے منتخب اشعار دیکھیں:

چپ چاپ سلگتا ہے دیا تم بھی تو دیکھو کس درد کو کہتے ہیں دَوا تم بھی تو دیکھو

3.3.6۔ سلیم محی الدین

پروفیسر سلیم محی الدین نہ صرف شاعر ہیں بلکہ ایک کامیاب محقق بھی ہیں اور منجھے ہوئے نقاد بھی۔ سلیم محی الدین جس دور میں ادبی دنیا سے 'وابستہ' ہوئے اس وقت ایک طرف قاضی سلیم، اختر الزماں ناصر، بشر نواز، حمایت علی شاعر، احسن یوسف زئی، میر ہاشم، وحید اختر، جے پی سعید، عصمت جاوید شیخ، عرفان پر بھنوی، قمر اقبال، شاہ حسین نہری، سحر سعیدی، اسلم مرزا، یوسف عثمانی، یونس فہمی، جاوید ناصر، عتیق اللہ، صادق، فہیم صدیقی، عارف خورشید، رؤف صادق جیسے اسیر انِ غزل کی وجہ سے، 'مراٹھواڑہ میں اردو غزل' کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، تو دوسری جانب نثر نگاری میں ابراہیم اختر، حمید سہروردی، رشید انور، رفعت نواز، الیاس فرحت، محمود شکیل، نعیم زبیری، حمید اللہ خاں، اثر فاروقی،، نورالحسنین، عارف خورشید، عظیم راہی، وغیرہ جیسے فدائین کہانی کی بدولت افسانہ اور 'اردو ناول تنقید و تجزیے' کے دور سے گزر رہے تھے۔ اُردو ادب کے ایسے سنہرے دور

ہیں شاعر سلیم محی الدین میدانِ تنقید میں 'میزان' لے کر 'مضمون تازہ' کے ساتھ نمودار ہوئے۔ جس کی تازگی اور مہک نے مشاہیر ادب سے نہ صرف داد و تحسین حاصل کی بلکہ اسے ادبی تنقید کے میدان میں ''مستحسن اقدام'' بھی قرار دیا۔

پروفیسر سلیم محی الدین کا قلمی سفر تقریباً چالیس برسوں پر محیط ہے۔اس عرصے میں ان کی پانچ کتابیں منصہ شہود پر آئیں۔پیشۂ تدریس سے وابستگی نے انھیں نہ صرف تحقیق کے دقیق صحرا سے گزارا بلکہ تنقید کے دشت و دریا میں غوطہ زنی کا مزہ بھی چکایا۔ نتیجہ یہ کہ تخلیق، تحقیق اور تنقید تینوں میدانوں میں انہوں نے اپنی صلاحیتوں کے جلوے بکھیرے ہیں۔دنیا بھر کے معروف ادبی رسائل و اخبارات میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں۔دیدہ ور (باسٹن) جدید ادب (جرمنی) اردو دنیا (دہلی) فکر و تحقیق (دہلی) تحریرِ نو (ممبئی) جیسے معیاری رسائل میں میں نے ان کی تحریریں پڑھی ہیں۔موصوف نے بہت کم لکھا لیکن جو لکھا انتخاب بن گیا۔ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔شعر نگاری میں قمر آقبال سے شرف تلمذ حاصل رہا ہے۔ تحقیق و تنقید میں بشر نواز جیسے فن کار فیض حاصل کرتے رہے۔برصغیر کے معروف مشاہیرِ ادب نے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ناصر عباس، عتیق اللہ ،نورالحسنین ،ارتکاز افصل ،اسلم مرزا، وغیرہ نے انکی تخلیقات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔انھیں نہ صرف قومی سطح کے سمینارس میں مدعو کیا جاتا ہے بلکہ بین الاقوامی سمینارس اور کانفرنسیس میں بھی بڑے عزت و احترام سے بلایا جاتا ہے۔اس سلسلے میں وہ ترکی ،چین ،ازبکستان وغیرہ ممالک کی سیر بھی کر چکے ہیں۔حج کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔دہلی، لکھنو، بھوپال، الہ آباد، کشمیر وغیرہ شمالی ہند کے تمام اردو مراکز میں ان شہرت کے چرچے ہیں۔

سلیم محی الدین تنقید میں آسان اور عام فہم زبان کے قائل ہیں۔انہیں شکایت ہے کہ آج ہمارے تخلیقی ادب سے زیادہ تنقیدی ادب، ترسیل کی ناکامی کا شکار ہو گیا ہے لکھتے ہیں:

> ''بنیادی طور پر ایک تخلیقی فن کار ہونے کے ناطے میں تحقیق و تنقید کو بھی اسی نظر سے دیکھتا ہوں۔یار لوگوں نے اصطلاحات کی بھرمار اور غیر مانوس بقراطی زبان کے استعمال کے باعث ان شعبہ ہائے ادب کو خاصہ ادق، خشک اور غیر مقبول بنادیا ہے۔آج تخلیقی ادب سے زیادہ ہماری تنقید ترسیل کے المیے کا شکار ہے جبکہ میرے نزدیک تنقید و تحقیق، تخلیقی ادب کے، مقابل زیادہ سہج اور سرل ترسیل کے متقاضی ہیں۔''(مضمون تازہ، ص۹)

بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابہام شاعری کا حسن ہے لیکن یہی ابہام اگر تنقید میں در آئے تو نقص بن جاتا ہے۔

ان کے شعری مجموعہ "وابستہ" میں غزلیں, نظمیں, فرد اور قطعات, یہ تمام اصناف دیکھنے کو ملتی ہیں. ان کی شاعرانہ شخصیت کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو نہ تو صرف روایت تک محدود رکھا اور نہ وہ جدیدیت کے اسیر ہوئے بلکہ

انہوں نے اردو کی شعری روایت سے استفادہ کرتے ہوئے جدید طرز اظہار کو فنی سلیقہ مندی کے ساتھ اپنایا. یہی وجہ ہے کہ ان کے شاعرانہ لب ولہجہ میں روایت کی خوشبو بھی ہے اور جدت وندرت کی تازگی بھی۔

سلیم محی الدین سرزمین دکن سے تعلق رکھتے ہیں جس نے ولی, سراج, وجد, قاضی سلیم, بشر نواز, قمر اقبال اور جاوید ناصر جیسے شعراء کو جنم دیا. ان شعراء کے کلام میں جو متانت وسادگی ہے, وہ سلیم محی الدین کے یہاں بھی محسوس کی جاسکتی ہے. ظاہر ہے ہر شاعر کا دنیا کو دیکھنے, برتنے, محسوس کرنے اور اپنے محسوسات کے اظہار کا اپنا مخصوص زاویہ ہوتا ہے. سلیم محی الدین کا بھی اپنا مخصوص زاویہ نظر ہے. انہوں نے دنیا کا مشاہدہ ایک ایسے فرد کی حیثیت سے کیا ہے جس کی نگاہ انسانی سماج کے ظاہری و باطنی دونوں پہلوؤں پر ہے. مشاہدہ کرتے وقت انہوں نے بڑی متانت و سنجیدگی, باریک بینی اور غور وفکر سے کام لیا ہے پھر اپنے مشاہدات کو مخصوص لب ولہجہ میں تراش کر پیش کیا ہے. دیکھنے کی چیز یہ بھی ہے کہ سلیم محی الدین نے جدید طرز اظہار سے ضرور کام لیا ہے مگر کہیں بھی شائستگی کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے. ان کی غزلوں اور نظموں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اردو کی کلاسیکی شعری روایت سے متانت و سنجیدگی اور سادگی و شائستگی کو اپنایا ہے اور جدیدیت سے استفادہ کرتے ہوئے انہوں نے ایسے جدید الفاظ واستعارات کو برتا ہے جس سے کلام میں زور اور حسن پیدا ہو. یہی وجہ ہے کہ ان کا طرز اظہار جدت وندرت کا حامل بھی ہے اور حسین ودلکش اور موثر بھی۔

سلیم محی الدین کی شاعری میں آج کے ماحول, اس کے شب وروز اور انسانی زندگی سے جڑی کیفیتوں کا انعکاس دلچسپ استعاراتی واشاراتی انداز میں ہوا ہے. چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کھڑکیوں پر سجے ہیں افسانے	برملا واقعہ ہے دروازہ
یاد کی دھوپ کا اک دریچہ کھلا	نیند کے سائبانوں کو موسم ملے
زندگی سے کوئی تو رشتہ ہو	تیر ہو نا کمان میں رہنا
کہنے کو ہیں گھر دو دو	بھٹک رہا ہے تنہا خواب
ہم بھی سینے میں آگ رکھتے ہیں	کوئی رشتہ کپاس مت کرنا

3.4۔ مشقی سوالات

۱۔ میرؔ کی غزل گوئی پر اظہار خیال کیجیے؟

۲۔ غالبؔ کی غزل گوئی کے امتیازات بیان کیجیے؟

۳۔ مجازؔ کی غزلوں کا اجمالی جائزہ لیجئے؟

۴۔ فراقؔ کی غزل گوئی پر روشنی ڈالیے؟

۵۔ بشر نواز کے حالات زندگی بیان کیجئے؟

۶۔ سلیم محی الدین کی غزل گوئی پر اپنی رائے قائم کیجئے؟

1.5۔ خلاصہ

میرؔ، غالبؔ، فراقؔ، مجازؔ، بشرؔ نواز، سلیم ؔمحی الدین اردو شاعری کے معروف شعرا ہیں۔ اس اکائی میں ان شعرا کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ میر کا دور شدید ابتری کا دور تھا۔ زندگی کے مختلف دائروں کی اقدار کی بے آبروئی ہورہی تھی۔ انسانی خون کی ارزانی، دنیا کی بے ثباتی اور ہمہ گیر انسانی تباہی نے انسانوں کو بے حد متاثر کیا۔ میر اس تباہی کے محض تماشائی نہ تھے بلکہ وہ خود اس تباہ حال معاشرہ کے ایک رکن تھے۔ جو صدیوں کے لگے بندھے نظام کی بربادی سے تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر کر رہ گیا تھا۔ اور اب اس کو جوڑنا ممکن نہ رہا تھا۔ میر نے اس ماحول کے اثرات شدت سے محسوس کیے ہیں۔ ان کی غزلوں میں اس تباہی کے نقوش ملتے ہیں۔ لٹے ہوئے نگروں، شہروں اور اجڑی ہوئی بستیوں کے حالات، بجھے ہوئے دلوں کی تصویریں، زمانے کے گرد وغبار کی دھندلاہٹیں، تشبیہوں اور استعاروں کی شکل میں میر کے ہاں موجود ہیں۔ بطور مثال ان کے کلام کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

روشن ہے اس طرح دلِ ویراں میں داغ ایک　　　اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

اردو شاعری میں جدت پسندی کی امامت و پیشوائی کا سہرا غالب کے سر بندھتا ہے، کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ غالب سے پہلے کسی نے جدت کی راہ اختیار نہیں کی۔ غالب فطری طور پر چوں کہ فلسفیانہ ذہن لے کر پیدا ہوئے تھے، اس لیے وہ مقتدی کی حیثیت سے شاعری کی دنیا میں بھلا اپنی پہچان کیوں کر بناتے؟ یہ ان کے ضمیر کو گوارہ نہ تھا اس لیے وہ اردو کی بے آب و گیاہ میدان میں اپنی جدت طرازی خیالات آفرینی، فکری بلندی اور ذہنی ہم آہنگی سے ایسی آب یاری کی کہ اس میدان کے مقتدیٰ اور امام تسلیم کیے گئے۔

مجازؔ19اکتوبر 1911ء میں قصبہ رودولی ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ان کا حقیقی نام اسرار الحق اور مجازؔ تخلص اختیار کیا۔ مجازؔ نے 1935 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے کیا تھا۔1936 میں دہلی ریڈیو اسٹیشن سے شائع 'آواز' کے پہلے مدیر مجازؔ ہی تھے۔انہوں نے کچھ وقت بمبئی انفارمیشن میں بھی کام کیا تھا اور پھر لکھنؤ آکر 'نیا ادب' اور 'پرچم' کی ادارت کی۔اس کے بعد دہلی میں ہارڈنگ لائبریری سے منسلک ہوئے تھے۔ مجازؔ کی مختصر زندگی کا خاصہ ان کی شاعری تھی۔ان کی سب سے بہترین نظم 'آوارہ' ہے، جس کے چند بند 1953 میں بنی فلم 'ٹھوکر' میں گلوکار طلعت محمود کی آواز میں کافی مشہور ہوئے۔ادبی رکنیتیں مجازؔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے رکن تھے۔ مجلس ادارت "نیا اَدب" لکھنؤ اجرا1939ء کے بھی رکن تھے۔انتقال 3دسمبر 1955 کو لکھنؤ میں مجازؔ ایک مشاعرے میں شامل ہوئے تھے۔اس کے دو دن بعد یعنی 5دسمبر 1955 کو وہ انتقال کر گئے تھے۔ڈاک ٹکٹ 2008 میں ایک ڈاک ٹکٹ حکومتِ ہند کی جانب سے مجاز کی یاد میں جاری ہوا تھا۔

فراق میں ایک انفرادیت تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو بطور شاعر منوا پائے۔ان کی کی شہر آفاق کتاب **گل نغمہ** بھی اسی دوران منظر عام پر آئی۔ جس کو ہندوستان کا اعلیٰ معیار ادب گیان پیٹھ انعام بھی ملا۔اور وہ آل انڈیا ریڈیو کے پروڈیوسر بھی رہے۔بطور ممتاز شاعر انہوں نے اردو شاعری کی اہم اصناف مثلاً غزل، نظم، رباعی اور قطعہ میں کے وہ ایک منفرد شاعر ہیں جنہوں اردو نظم کی ایک درجن سے زائد اور اردو نثر کی نصف درجن سے زائد جلدیں ترتیب دیں اور ہندی ادبی اصناف پر متعدد جلدیں تحریر کیں، ساتھ ہی ساتھ انگریزی ادبی و ثقافتی موضوعات پر چار کتابیں بھی لکھی۔جدید شاعری میں فراق کا مقام بہت بلند ہے۔آج کے شاعری پر فراق کے اثر کو باآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔بہترین شخصیت کے مالک تھے حاضر جوابی میں ان کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ بین الاقوامی ادب سے بھی شغف رہا۔ تنقید میں رومانی تنقید کی ابتدا فراق سے ہوئی۔

انہوں نے اپنے 60 سالہ شعری سفر میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے رجحانات کو براہ راست اپنی شاعری میں برتا ہے۔ان کے دو شعری مجموعے ''رائیگاں''اور ''اجنبی سمندر''منظر عام پر آچکے ہیں، جن کی برصغیر ہند و پاک کے ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی۔ان کے تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ''نیا ادب نئے مسائل'' بھی شائع ہو چکی ہے۔ دیوناگری رسم الخط میں بھی ان کا کلام شائع ہو چکا ہے۔

انہوں نے 1953 سے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور 1954ء ہی سے انہیں بڑے بڑے مشاعروں میں کلام سنانے کے لئے مدعو کیا جانے لگا۔ مشاعروں میں شرکت کی وجہ سے انھیں اس دور کے کئی نامور شعراء سے شرف نیاز کا موقع ملا، جن میں جوش ملیح آبادی، جاں نثار اختر، اخترالایمان وغیرہ شامل ہیں۔انھوں نے کہا کہ مخدوم محی الدین کا ان پر احسان ہے کہ انہوں نے

پہلی بار حیدر آباد کے مشاعرے میں انھیں متعارف کرایا۔اس کے بعد سے وہ حیدر آباد کے ہر مشاعرے میں مدعو کئے جانے لگے ۔ان کے کلام کو باذوق سامعین نے ہمیشہ پسند کیا اور اپنی داد وستائش سے ان کے حوصلے بڑھائے۔

پروفیسر سلیم محی الدین کا قلمی سفر تقریباً چالیس برسوں پر محیط ہے۔اس عرصے میں ان کی پانچ کتابیں منصہ شہود پر آئیں۔پیشۂ تدریس سے وابستگی نے انھیں نہ صرف تحقیق کے دقیق صحرا سے گزارا بلکہ تنقید کے دشت ودریا میں غوطہ زنی کا مزہ بھی چکایا۔ نتیجہ یہ کہ تخلیق، تحقیق اور تنقید تینوں میدانوں میں انہوں نے اپنی صلاحیتوں کے جلوے بکھیرے ہیں۔دنیا بھر کے معروف ادبی رسائل واخبارات میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں۔دیدہ ور (باسٹن) جدید ادب (جرمنی) اردو دنیا (دہلی) فکر و تحقیق (دہلی) تحریرِ نو (ممبئی) جیسے معیاری رسائل میں میں نے ان کی تحریریں پڑھی ہیں۔موصوف نے بہت کم لکھا لیکن جو لکھا انتخاب بن گیا۔ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔شعر نگاری میں قمرؔ اقبال سے شرف تلمذ حاصل رہا ہے۔

3.6۔الفاظ و معنی

1۔مہتاب بکف	چاند ہات میں لئے
2۔سمن زار	چنبیلی کا تختہ یا باغ
3۔چارہ گری	علاج، مدد، اعانت
4۔خرام ناز	متوالی چال، نخروں والی چال
5۔تیر نیم کش	ادھ کھلی آنکھ کا تیر

3.7۔سفارش کردہ کتب

1۔دیوانِ میرؔ۔۔۔۔۔۔۔۔میر تقی میرؔ

2۔دیوان غالبؔ۔۔۔۔۔۔۔مرزا غالبؔ

3۔دیوان مجازؔ۔۔۔۔۔۔۔۔اسرار الحق مجازؔ

4۔دیوان فراقؔ۔۔۔۔۔۔۔فراقؔ گورکھپوری

5۔رائگاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔بشر نوازؔ

6۔وابستہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سلیم محی الدین

7۔تاریخ ادب اردو۔۔۔۔۔نور الحسن نقوی